Registered No. L. 4186

رجب
شعبان } ۱۳۶۰ھ
رمضان

جلد ۱۹ — عدد ۱
جلد ۱۹ — عدد ۲
جلد ۱۹ — عدد ۳

٦٨٦ء

اشاعت خاص

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک۔ پونچھ روڈ۔ لاہور

قیمت سالانہ عہ

قیمت بے جلد عہ

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت حصہ اول بیجلد ایکروپیہ آٹھ آنے قیمت مجلد دو روپیہ علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات } یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہو گئی ہیں۔

ضخامت ۳۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد ۱/۴/- مجلد ۱/۸/- محصولڈاک -/۴/-

فہرست مضامین

رجب شعبان و رمضان ۱۳۶۰ھ مطابق ستمبر اکتوبر و نومبر ۱۹۴۱ء جلد ۱۹ عدد ۱، ۲، ۳

باہتمام ابو الاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس سرکلر روڈ میں طبع ہوکر
دفتر ترجمان القرآن پونچھ روڈ، مبارک پارک لاہور سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اکتوبر کے آخر میں انجمن تاریخ و تمدن اسلامی، مسلم یونیورسٹی کی دعوت پر علی گڈھ جانیکا اتفاق ہوا۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر مناسب سمجھا گیا کہ چند اور مرکزی مقامات کا دورہ بھی کر لیا جائے تاکہ تحریک اسلامی کی دعوت براہ راست لوگوں تک پہنچائی جاسکے اور اگر کچھ غلط فہمیاں موجود ہیں تو بر سر موقع انکو صاف کرنیکی کوشش کی جائے۔ وقت میں زیادہ گنجائش نہ تھی، تاہم اس سفر کے سلسلہ میں دہلی، علی گڈھ، الٰہ آباد، سرائے میر، لکھنؤ اور بریلی کا دورہ کیا گیا۔ ہر جگہ ہر طبقۂ خیال کے لوگ کثرت سے ملے۔ کھلے دل سے تبادلۂ خیالات ہوا۔ جو کچھ مجھے عرض کرنا تھا وہ میں نے صاف صاف عرض کیا اور الحمدللہ کہ التفات کے ساتھ سنا گیا۔ جو کچھ لوگوں کے دلوں میں تھا وہ بھی انہوں نے بے تکلف بیان کیا، شکوک، شبہات، اعتراضات، شکایات، سب ہی چیزیں بلا کسی لاگ لپیٹ کے سامنے آگئیں اور حتی الامکان ان کو رفع کرنیکی کوشش کی گئی۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ دعوت کی اس تخم ریزی میں جتنے بیج پھینکے گئے ان میں سے کتنوں نے زمین میں جڑ پکڑی اور کتنے ہوا میں اڑ گئے۔ اور اس کا علم بھی اللہ ہی کو ہے کہ افہام و تفہیم کی جو سعی کی گئی اس سے کتنے لوگ مطمئن ہوئے اور کتنے غیر مطمئن رہ گئے لیکن اتنا ضرور ہے کہ جو وقت اس سفر میں صرف ہوا بیکار صرف نہیں ہوا۔ کوئی بڑا نتیجہ نہ نکلے نہ سہی، یہ سعی انشاء اللہ بے نتیجہ تو نہ ہوگی۔

انفرادی شبہات و اعتراضات جو دوران سفر میں زیر بحث آئے، ان کا ذکر تو چنداں ضروری نہیں

لیکن چند غلط فہمیاں جن سے قریب قریب ہر جگہ سابقہ پیش آیا، انکے متعلق اِن صفحات میں بھی کچھ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی بعض جماعتوں کو یہ شبہ ہے کہ "جماعت اسلامی" اُنکی کوئی حریف جماعت ہے، اور اُن سے برسرِ پیکار ہونا چاہتی ہے۔ اس شبہ کے جواب میں بالمشافہہ بھی تصریح کی جا چکی ہے اور اب تحریری شکل میں بھی تصریح کی جاتی ہے کہ ہماری مخالفت کسی خاص جماعت سے نہیں بلکہ اُس نظام زندگی سے ہے جو خدا کی اطاعت کے سوا کسی دوسرے اقتدار کی اطاعت پر، اور خدائی قانون و ضابطہ کے سوا کسی دوسرے قانون و ضابطہ کی پابندی پر قائم ہے۔ ہم کسی گروہ سے نہیں بلکہ صرف اِس نظام سے برسرِ پیکار ہیں۔ اور ہمارا مقصد اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ انسانی تمدن و تہذیب کا پورا نظام بندگی باطل کی بنیادوں سے ہٹ کر بندگی حق کی بنیادوں پر تعمیر ہو۔ اس مقصد کے حصول کی کوشش میں تنقید و تخریب اور دعوت و تبلیغ کی جو زد آپ سے آپ اُن تمام اداروں اور گروہوں پر پڑتی ہے جنکا کوئی ربط و تعلق اِس نظام سے ہے، وہ تو بہر حال ناگزیر ہے، نہ اس سے ہم کسی کو بچانے کی فکر کر سکتے ہیں نہ کسی کو ہم سے یہ توقع رکھنی چاہیے کہ ہم اس معاملہ میں اسکے ساتھ کوئی رعایت کرینگے۔ البتہ یہ بات کہ غلط بنیادوں پر کام کرنے والے اداروں اور گروہوں میں سے بعض کو چھوڑ کر بعض کو خاص طور پر ہم ہدف بنائیں، تو یہ ہمارے اصول کے خلاف ہے اور ایسا گمان جس کسی کو بھی ہو ہم اس سے درخواست کرینگے کہ وہ اسے دل سے نکال دے۔ ایک عالمگیر نظریہ اور نصب العین رکھنے والی جماعت کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ کسی ایک خطۂ زمین یا کسی محدود آبادی میں چھوٹے چھوٹے مقامی اور ہنگامی مقاصد کے لیے کام کرنے والے گروہوں کو اپنا مدِ مقابل بنا کر انکے خلاف برسرِ پیکار ہو۔ ہندوستان کی مقامی پارٹیاں تو در کنار، ہم تو برٹش امپائر یا جرمن امپائر کو بھی اپنا خصوصی مدِ مقابل نہیں سمجھتے۔ ہمارا مدِ مقابل اگر کوئی ہے تو وہ دنیا کا پورا نظام حیات ہے جو انسانی ساخت کے قوانین پر چل رہا ہے۔

چونکہ جماعت ابھی نئی نئی بنی ہے اور اسکے تمام ارکان پوری طرح تحریک اسلامی کے مزاج میں نہیں

ڈھل سکتے ہیں اسلیے کہیں کہیں مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے بعض رفقاء مقامی جماعتوں کے ساتھ بحث و مناظرہ میں الجھ گئے اور اسی سے یہ بدگمانیاں پیدا ہوئیں کہ یہ کوئی نئی جماعت پارٹی پالیٹکس کے میدان میں اتری ہے - میں نے اس روش کے خلاف زبانی ہدایات بھی دیدی ہیں اور اب تمام ارکان جماعت کو عام ہدایت کرتا ہوں کہ سابق مشاغل زندگی کے جو اثرات انکی ذہنیتوں اور انکی عادات میں ابھی تک باقی ہیں انکو نکال ڈالیں، اپنے بلند مقصد کے مطابق اپنی نظر کو وسیع کریں، اور ان جھگڑوں میں لذت لینا چھوڑ دیں جو بالعموم نفسانیت کی آمیزش سے مزے دار بن جایا کرتے ہیں -

---

ایک اور شبہ لوگوں کے دلوں میں یہ ہے کہ عام جماعتوں کی طرح ہماری دعوت بھی شاید اپنی جماعت کی طرف ہی ہے اور یہ کہ جو لوگ ہم سے الگ ہیں انکو ہم مطلقاً حق پر سمجھتے ہی نہیں - باوجودیکہ اس شبہ کی تردید قیام جماعت کی روداد میں پوری تفصیل کے ساتھ کردی گئی ہے مگر پھر بھی جگہ جگہ اس قسم کے سوالات کیے گئے جن سے معلوم ہوا کہ ابھی تک ہماری پوزیشن لوگوں کی سمجھ میں اچھی طرح نہیں آئی ہے -

دراصل ہماری دعوت اُس مخصوص نظام جماعت کی طرف نہیں ہے جو ہم نے قائم کیا ہے، بلکہ عقیدۂ توحید و رسالت اور اُس نصب العین کی طرف ہے جو اللہ کو اپنا بادشاہ اور رسول کو اپنے بادشاہ کا نمائندہ تسلیم کرنے کے ساتھ ہی لازماً ہر مسلمان کا نصب العین قرار پاتا ہے - ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ زمین پر خدا کے صالح بندوں کی کوئی ایسی جماعت مرتب ہو جو تمام دوسرے مقاصد اور مساعی اور مشاغل سے قطع نظر کر کے اسی عقیدہ کی طرف دنیا کو دعوت دینے اور اسی نصب العین کے حصول کی جدوجہد کرنے کے لیے کھڑی ہو جائے اگر ایسی کوئی جماعت موجود ہوتی تو ہمیں جماعت سازی کا کوئی شوق نہ تھا کہ خواہ مخواہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ چنتے - ہمیں اپنے آپکو اُس جماعت کے ساتھ وابستہ کردینے میں ہرگز تامل نہ ہوتا - مگر جب ایسی کوئی جماعت ہمیں نظر نہ آئی جس نے حاکمیت غیر اللہ کے علمی و عملی ابطال کو اور حکومت الٰہیہ کے قیام کی جدوجہد کو اپنا مقصد وحید

بنایا ہو تو ہم نے مجبوراً خود ایک جماعت بنانے کا اقدام کیا۔ اب جو لوگ اس عقیدہ اور نصب العین میں ہم سے متفق ہیں انکے لیے دو راستے کھلے ہوئے ہیں: اگر وہ ہمارے نظام جماعت کو صحیح سمجھتے ہیں اور ہم پر بھی اطمینان رکھتے ہیں تو ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں۔ اور اگر ہمارے نظام سے یا ہماری شخصیتوں سے وہ مطمئن نہیں ہیں تو خود اس کار خیر کے لیے کوئی جماعت بنائیں اور اپنی صوابدید کے مطابق جدوجہد کریں۔ دونوں صورتیں یکساں صحیح اور برحق ہونگی۔ ایسی دس جماعتیں بھی اگر بن جائیں جنکا عقیدہ اور نصب العین یہی ہو اور نظام مختلف ہوں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ہمیں ان سے رقابت نہ ہوگی بلکہ مسرت ہوگی کہ الحمد للہ اس راستہ پر چلنے کے لیے اور قافلے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ چاہے ابتداً ہم الگ الگ ہی چلیں، مگر مسلک و مقصد کی وحدت ان شاء اللہ سب کو ایک کر دیگی۔ اور کم از کم اپنی حد تک تو ہم یہ یقین دلانے کے لیے تیار ہیں کہ اس امر حق کی خدمت کے لیے کوئی دوسری جماعت وجود میں آئے تو اسکے ساتھ ہم بخوشی تعاون کرینگے اور اگر اسکے نظام اور کار فرما اشخاص کو ہم نے صالح تر پایا تو ہمیں اپنے جداگانہ وجود کو ختم کر کے انکے اندر جذب ہو جانے میں بھی ذرہ برابر تامل نہ ہوگا۔

بعض لوگ میرے فقہی و کلامی مسلک اور اس خاص طریقہ کو جو مسائل دینی کی تحقیق و تشریح میں میں نے اختیار کیا ہے بعینہٖ جماعت اسلامی کا مسلک اور طریقہ سمجھتے ہیں اور انکا گمان یہ ہے کہ یہ جماعت اسی مسلک اور طریقہ پر قائم ہوئی ہے۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر جماعت کی اصل تحریک پر گفتگو کرتے کرتے اکثر میری ذاتی آراء کی بحث درمیان میں چھیڑ دی جاتی ہے، گویا کہ میری تمام آراء جماعت کی آراء ہیں اور کسی شخص کے فقہی و کلامی جزئیات میں مجھ سے اختلاف رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اسکا اختلاف جماعت سے ہے۔

اس غلط فہمی کو بھی قیام جماعت کی روداد میں پوری وضاحت کے ساتھ رفع کر دیا گیا تھا لیکن افسوس ہے کہ بہت سے لوگوں کے لیے اعتدال کے اس طریقہ کو سمجھنا مشکل ہو رہا ہے جو ہم نے اس باب میں اختیار کیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کتاب و سنت میں غور و تدبر کرنے والے تمام لوگ تمام مسائل میں بالکل ایک ہی نتیجہ پر تو نہیں پہنچ سکتے۔ دین کی بنیاد جن اساسی

امور پر ہے اتفاق صرف انہی میں ممکن ہے۔ باقی رہے جزئیات و تفصیلات، تو دین کے حدود میں رہتے ہوئے مختلف اہلِ علم اُن میں مختلف نتائج پر پہنچ سکتے ہیں اور سلف سے خلف تک یہ اختلاف ہوتا ہی رہا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ جو شخص بھی مسائل دینی پر کلام کریگا، یا دنیا کے معاملات پر تعلیماتِ دینی کی روشنی میں اظہارِ خیال کریگا وہ بہر حال اپنی ہی صوابدید کی بنا پر کریگا اور اپنی ہی زبان اور اپنے ہی طرزِ بیان میں کریگا۔ اس صوابدید اور زبان و طرزِ بیان میں بھی زیادہ سے زیادہ اتنا ہی اتفاق ممکن ہے کہ ایک شخص کو دوسرے شخص کی بیشتر چیزیں پسند آجائیں، مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی شخص کے تمام خیالات اور ہر لفظ اور ہر اسلوبِ بیان سے تمام لوگوں کو اتفاق ہو۔ اب اگر دین کی خدمت کے لیے اہلِ ایمان کی کوئی جماعت بن سکتی ہے تو اسی طرح بن سکتی ہے کہ اساساتِ دین، جو تمام اہلِ حق کے درمیان متفق علیہ ہیں انہی کو جماعت کی اساس بنایا جائے اور اُس نصب العین کے لیے کام کرنے پر سب مجتمع ہو جائیں جو اللہ اور اسکے رسول نے ہمکو دیا ہے۔ باقی رہے جزئیات تو اُن کے سوا چارہ نہیں، اور یہی حق بھی ہے کہ حدودِ دین کے اندر جتنے مختلف مسلک ممکن ہیں اُن سب کے لیے جماعت میں گنجائش رکھی جائے، نہ ایک کا قول دوسرے پر حجت ہو، اور نہ ایک کی آزادی کو دوسرا سلب کرے۔

انہی وسیع اصولوں پر ہماری جماعت قائم ہوئی ہے۔ ہمارا اجتماع صرف عقیدے اور نصب العین پر ہے، اور جو شخص بھی کسی وقت جماعت کا امیر ہو اسکی اطاعت صرف انہی امور میں ہے جو دستور کے مطابق نظامِ جماعت سے یا نصب العین کے لیے جدوجہد سے متعلق ہوں۔ انکے ماسوا دوسرے امور میں امیرِ جماعت کأحدٍ من الناس ہے، وہ بھی ایک رائے رکھتا ہے اور دوسرے ارکانِ جماعت کو بھی رائے رکھنے کا حق ہے۔

ایک دوست نے میرے مضمون "حقوق الزوجین" کے اس فقرے کی طرف توجہ دلائی ہے:

"اب اگر کوئی شخص چار مہینے کے بعد اسکو رجوع کا حق دیتا ہے تو گویا وہ اس کی مہلت میں اضافہ کرتا ہے جو کتاب اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے صریح تجاوز ہے۔" (صفحہ ۲۸۲ - سطر ۶)

فی الواقع خط کشیدہ الفاظ لکھنے میں مجھ سے چوک ہوئی۔ جس قول سے اختلاف کرتے ہوئے میں نے یہ الفاظ لکھے ہیں وہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، اور حضرت علیؓ و ابنِ عمرؓ سے بھی ایک قول اسی معنی میں منقول ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں

بے احتیاطی سے اس قول کے خلاف ایسے الفاظ لکھ گیا جن سے ان بزرگ ہستیوں کی شان میں سوءِ ادب کا پہلو نکلتا ہے ناظرین ازراہِ کرم اس فقرے کو قلم زن کر کے یہ الفاظ لکھ لیں: "اور یہ اضافہ بظاہر کتاب اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے زائد ہے"۔ اللہ اس شخص کو اجر عطا فرمائے جس نے مجھے میری غلطی پر متنبہ کیا۔

اسی مضمون "حقوق الزوجین" میں تین مقامات پر "طلاق بائن" کا لفظ اس طلاق کے لیے استعمال کیا گیا ہے جسے فقہاء اپنی اصطلاح خاص میں مغلظہ کہتے ہیں (ص ۲۹۳ - ص ۳۲۷ - ص ۳۵۷)۔ اس سے بعض حضرات کو غلط فہمی ہوئی، کیونکہ فقہاء کی اصطلاح میں بائن اس طلاق کو کہتے ہیں جس سے زوجین کا ازدواجی تعلق منقطع تو ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، اور وہ طلاق جس کے بعد عورت دوبارہ اس شوہر کے نکاح میں نہیں آسکتی تاوقتیکہ اس کا نکاح کسی اور شخص سے ہو کر فرقت واقع نہ ہو جائے اس کے لیے فقہاء کی اصطلاح میں مغلظہ کا لفظ ہے۔ میں نے طلاق بائن دوسری قسم کی طلاق کے لیے استعمال کیا اور لوگوں کو گمان ہوا کہ میں یہ لفظ فقہاء کی معروف اصطلاح ہی میں استعمال کر رہا ہوں۔ مناسب ہے کہ اس فرق کو مقامات مذکورہ پر نوٹ کر لیا جائے۔

اصل یہ ہے کہ میں تحقیق ہی میں نہیں، اصطلاحات کے استعمال میں بھی ذرا آزادی سے کام لینے کا خوگر ہوں۔ فقہاء نے بعد میں سہولت کے لیے رجعی اور بائن اور مغلظہ کی الگ الگ اصطلاحیں بنائی ہیں۔ لیکن حدیث میں لفظ بائن اسی معنی میں آیا ہے جس میں میں نے استعمال کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کانت تبین وتکون معصیة اور حضرت ابن عباس کا قول قد عصیٰ ربہ وبانت امرأتہ، دونوں میں بائن اسی طلاق کو کہا گیا ہے جسے بعد والوں کی اصطلاح میں مغلظ کہتے ہیں۔

"حقوق الزوجین" ہی کے سلسلہ میں ایک صاحب لکھتے ہیں:

"اس مضمون میں مسلمانوں کی اصلاح حال کے لیے جو صورت پیش کی گئی ہے وہ اگرچہ بطور تنزل پیش کی گئی ہے، لیکن بہر حال غیر اسلامی حکومت سے استعانت و استیذان کی دبے الفاظ میں ضرورت تو محسوس کی گئی ..... یقیناً آپ کا مطلب نہیں

ہے کہ حکومت وقت سے کسی دستور کی منظوری حاصل کی جائے - فٹ نوٹس میں جا بجا اسکی تردید موجود ہے - لیکن بادی النظر میں جو چیز برسبیل تنزل پیش کی گئی ہے شائد سطحی نگاہ والے اس سے غلط شبہ پیدا کریں - لہذا اگر ذرا مزید توضیح کردی جائے تو مناسب ہے۔"

الحمد للہ کہ اہل ایمان کے احساسات میں اتنی نزاکت تو پیدا ہو گئی کہ غیر الٰہی حکومت سے استعانت و استیذان کا شائبہ بھی طبائع پر شاق ہونے لگا۔ اللہ اس کیفیت کو بڑھائے حتی کہ غیر الٰہی حکومت کے ماتحت رہتے ہوئے ہر سانس سینے میں چھری کی طرح گذرتا معلوم ہو، پانی کا ہر گھونٹ اور کھانے کا ہر نوالہ زہر و حنظل کی سی تلخیوں کے ساتھ اترے بستر اپنی ساری نرمیوں کے باوجود کانٹوں سے بھرا معلوم ہونے لگے اور کسی مومن کو اس وقت تک چین نہ آئے جب تک اللہ کی زمین پر اللہ کے سوا ہر ایک کا حکم چلنا بند نہ ہو جائے۔

میں اپنے بھائی کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے احساسات بھی اس باب میں وہی ہیں جو خود انکے ہیں - مگر جو کچھ میں نے "برسبیل تنزل" کہا ہے اس سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان جو اب مجالس قانون ساز سے "شرعی قوانین" پاس کرانے پر اتر آئے ہیں اپنی اس غلطی سے باز آئیں اور اگر انہیں موجودہ نظام حکومت ہی کے اندر اپنی شرعی مشکلات حل کرنی ہیں تو اسکے لیے صریح معصیت کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے ایسا طریقہ اختیار کریں جو کم از کم حدِ جواز کے اندر تو ہو۔

کاغذ کی شدید گرانی اب حدِ برداشت سے گذرتی جا رہی ہے - اس وجہ سے مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ رسالہ کی ضخامت میں ۸ صفحے کم کر دیے جائیں - قیمت میں اضافہ ناظرین رسالہ کے لیے ناخوشگوار ہے اور کاغذ کے معیار کو پست کرنا ذوقِ سلیم پر گراں، لہذا اسکے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا کہ رسالہ ۸۰ صفحات کے بجائے ۷۲ صفحات پر شائع ہو۔

مقدمہ تفسیر نظام القرآن

تالیف مولانا حمید الدین فراہیؒ - ترجمہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

[استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان پر جو مقدمہ لکھا ہے اُس میں تفسیر کے متعلق نہایت اصولی مباحث بیان ہو گئے ہیں - اس کا ترجمہ عام اہل علم کے فائدہ کے لیے شائع کیا جاتا ہے - جو بحثیں رسالہ کے عام قارئین کے لیے کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتیں وہ ہم نے حذف کر دی ہیں - جب یہ ترجمہ بشکل کتاب شائع ہوگا، اس میں شامل کر دی جائینگی - بعض بحثیں ناتمام رہ گئی ہیں لیکن فوائد سے خالی نہیں - اس کو غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے - سرسری نظر سے مطالب گرفت میں نہیں آئینگے - مترجم]

اللہ تعالیٰ کی توفیق و عنایت سے اس کتاب میں میں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ آیات قرآن کے باہمی تعلق کو واضح کروں اور قرآن مجید کی ایسی سادہ تفسیر لکھوں جو ان تمام اختلافات سے بالکل پاک ہو جو ہمارے اندر عہد نبوت کے بعد پیدا ہوئے - میں نے آیات کے معانی انکی مماثل دوسری آیات کی روشنی میں متعین کیے ہیں اور ہر سورت کے نظام کو اسکے عمق میں اُتر کر اور اس کے سیاق کو سمجھ کر معلوم کرنے کی کوشش کی ہے - اور اس جدوجہد سے جو کچھ سمجھ میں آیا ہے اس کو عقل و نقل سے پوری طرح مدلل کیا ہے - اور اس راہ میں صرف اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی بصیرت میری رہنما رہی ہے - میں نے کسی شخص کی پیروی نہیں کی ہے - تاہم یہ سمجھنا صحیح نہیں ہوگا کہ نظم کی تلاش میں، میں منفرد ہوں - اس سے پہلے بھی علماء کی ایک جماعت نے اس راہ میں کوشش کی ہے اور اس پر کتابیں لکھی ہیں - علامہ سیوطی رحمۃ اللہ نے اتقان میں لکھا ہے :-

ابوحیان کے شیخ علامہ ابو جعفر بن زبیر[1] نے خاص اس عنوان پر ایک کتاب تالیف کی ہے - اس کا نام

[1] بانکی پور پٹنہ کی اورنٹیل لائبریری میں اس کتاب کا ایک نسخہ (9) موجود ہے - میرے پاس اسکی نقل موجود ہے - مصنف کا نام
[illegible]

البرہان فی مناسبۃ سور القرآن ہے۔ اہل عصر میں سے شیخ برہان الدین بقاعی نے بھی اپنی کتاب نظم الدرر فی تناسب الآی والسور میں نظم کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا ہے۔"

اس کے بعد علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب کا بھی ذکر کیا ہے جس میں سورتوں اور آیتوں کی مناسبت کے علاوہ اعجاز قرآن کے وجوہ بھی بیان کیے ہیں۔ نیز فرماتے ہیں کہ "نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے۔ اس کے اشکال کی وجہ سے علماء نے اس سے بہت کم تعرض کیا ہے۔ امام فخرالدین رازی تنہا شخص ہیں جنھوں نے اس کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی اور انھوں نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآنی لطائف کا بڑا حصہ ترتیب و ربط کے اندر چھپا ہوا ہے۔"

مجھے خود امام رازیؒ کی تفسیر میں، آیت ولو جعلناہ قرآنا اعجمیا الآیہ (حم سجدہ) کے تحت ان کی یہ تقریر ملی:-

"اس آیت کی شان نزول کے باب میں مروی ہے کہ کفار نے ازراہِ شرارت کہا کہ قرآن مجید کسی عجمی زبان میں کیوں نہیں نازل کیا گیا تو یہ آیت اُتری۔ میرے نزدیک اس طرح کی باتوں سے قرآن مجید پر سخت اعتراض لازم آتا ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ قرآن میں ایسی آیتیں ہیں جن میں باہمد گر کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور یہ چیز قرآن مجید پر ایک بہت بڑے اعتراض کا دروازہ کھولتی ہے۔ اس اعتراض کے ہوتے ہوئے قرآن کو ایک معجز کتاب ثابت کرنا تو الگ رہا ہم اس کے ایک منظم کتاب ہونے کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورہ شروع سے لیکر آخر تک بالکل مسلسل کلام ہے (اس کے بعد سورہ کے مضمون پر اجمالاً گفتگو کر کے فرماتے ہیں) ہر شخص جس میں انصاف ہو گا وہ دیکھ سکتا ہے کہ اگر آیت کی وہ تفسیر کی جائے جو ہم نے کی ہے تو یہ سورہ شروع سے کر آخر تک ویسے منظم کلام کی صورت میں ڈھل جاتی ہے جو ایک خاص موضوع کو پیشِ نظر رکھتا ہو۔ اور یقیناً یہ تفسیر اس تفسیر سے کہیں بہتر ہو گی جو لوگ بیان کرتے ہیں۔"

اس کے برعکس ایک دوسری جماعت ہے جس کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں کوئی نظم نہیں ہے
شیخ عزالدین بن عبدالسلام لکھتے ہیں :-

"قرآن مجید، بیس سال سے کچھ زیادہ کی طویل مدت میں، مختلف حالات کے لیے گوناگوں احکام لے کر نازل ہوا، جس چیز کا نزول اس طرح ہوا ہو اس میں کسی قسم کا ربط و نظم نہیں ہو سکتا۔"

یہ علماء کے دو مختلف مذہب ہیں اور دونوں مذہبوں کے حامی و مؤید موجود ہیں۔ میرے نزدیک پہلا مذہب صحیح ہے اور میں اس کا پیرو ہوں۔ اس تفصیل سے میں دو باتیں واضح کرنی چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ یہ ایسی چیز نہیں ہے جس سے علماء نے یک قلم سکوت کیا ہو بلکہ بعضوں نے اس کی طرف نہایت اہتمام کے ساتھ توجہ کی ہے۔ دوسری یہ کہ ایک تنگ راہ ہے جس کے چلنے والے تھوڑے ہیں اور ایک ایسا مدفون خزانہ ہے جس کا بہت قلیل حصہ دریافت ہو سکا ہے۔ مجھ پر نظم کا دروازہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے، سب سے پہلے سورۂ بقرہ اور سورۂ قصص میں کھولا۔ اور اس کی طرف رہنمائی باہر سے نہیں بلکہ خود قرآن کے اندر سے ہوئی۔ میں قرآن کی تلاوت کا دلدادہ تھا اور اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہوں کہ میرے لیے سب سے زیادہ محبوب اور لذیذ کتاب یہی ہے۔ میں سُنا کرتا تھا کہ قرآن مجید چونکہ مختلف اوقات و حالات میں تھوڑا تھوڑا نازل ہوا ہے اس لیے نظم کے اعتبار سے سب سے زیادہ منتشر کتاب ہے لیکن جب دو سورتوں میں مجھے نظم معلوم ہو گیا تو بقیہ سورتوں پر غور کرنے کی تحریک ہوئی۔ یہ اس زمانہ کا قصہ ہے جب میں ابتدائی زندگی کی مشغولیتوں میں منہمک تھا اور اس طرح کے کام کے لیے بہت کم وقت بچا سکتا تھا۔ اس طرح دس سال سے کچھ زیادہ کی مدت گذر گئی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق نے میری دستگیری فرمائی اور میں نے قرآن پر ایک طرف سے، اس نقطۂ نظر سے، غور کرنا شروع کیا اور سال بھر کی مدت میں اس کو تمام کیا۔ اسکے بعد یہ خیال ہوا کہ اپنے فکر و تدبر کا نتیجہ لوگوں کے سامنے پیش کروں لیکن ایک عظیم ذمہ داری اور اسکے دور رس نتائج کے ہیبتناک احساس نے مجھے ڈرا دیا۔ چنانچہ ایک طویل مدت تک میں قرآن مجید

پر بار بار غور کرتا رہا اور اللہ تعالیٰ سے برابر دعا مانگتا رہا کہ وہ مجھے نفس کی شرارتوں اور جہل کی آفتوں سے محفوظ رکھے اور ہر چند کہ حقیقت ایک عرصہ سے میرے سامنے بالکل غیر مستور تھی لیکن میری دلی خواہش یہی تھی کہ میں اسکے اظہار کی مسئولیت اور اس کے خشک و تر اور خیر و شر کی ذمہ داریوں سے بچا لیا جاؤں۔ لیکن مختلف اسباب نے مجھے مجبور کیا کہ اس ذمہ داری کے اٹھانے سے گریز نہ کروں۔

۱۔ سب سے پہلی چیز جس نے مجھے اس ذمہ داری کے لیے مجبور کیا یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ تاویل کا بیشتر اختلاف نتیجہ ہے اس بات کا کہ لوگوں نے آیات کے اندر نظم کا لحاظ نہیں رکھا۔ اگر نظم ظاہر ہوتا اور عمود کلام سامنے آجاتا تو سب ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاتے اور سب کے منہ سے ایک ہی صدا بلند ہوتی کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَاءِ (ایک بار آور درخت کے مانند جس کی جڑ زمین کے اندر دھنسی ہوئی اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں) اور سارے مسلمان اللہ کے رشتہ کو متحد ہو کر تھام لیتے جیسا کہ فرمایا ہے: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (اور سب ملکر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو اور منتشر ہو)۔ لیکن جب صورت حالات اسکے بالکل برعکس ہے اور لوگوں نے اس حبل اللہ المتین کو جس کی تعریف یہ ہے کہ (لَا یَاْتِیْہِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ الآیہ) ٹکڑے ٹکڑے سمجھ رکھا ہے تو اس تفرق سے نجات کی کیا شکل ہے؟ حالت یہ ہے کہ ہر فریق اپنے خیال کے مطابق قرآن کی تاویل کرتا ہے اور کلام کو اسکی صحیح سمت سے ہٹا کر جس وادی میں چاہتا ہے گھسیٹتا ہے اور نظم کلام، جو صحیح سمت کو متعین کرنے والی چیز ہے اور جس سے اہل بدعت اور اصحاب زیغ و تحریف کی کجرویوں کی اصلاح ہو سکتی ہے وہ بیچ سے بالکل غائب ہے۔

۲۔ دوسری چیز جو اسکے لیے محرک ہوئی وہ ملحدین کا طعن ہے۔ انھوں نے قرآن مجید پر بے نظمی کا الزام لگایا اور میں نے دیکھا کہ علماء اسلام بجائے اسکے کہ حق کی شہادت دیں اور کتاب الٰہی سے اس الزام کو دفع کریں، اسی قسم کی باتیں خود بولنے لگے جس قسم کی باتیں یہ ملحدین مارقین کہہ رہے تھے کَبُرَتْ کَلِمَۃً

تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ ایسی حالت میں میرے لیے ممکن نہ تھا کہ میں حق کو سرنگوں اور باطل کو سربلند دیکھتا رہوں اور پھر خاموش رہوں۔ بالخصوص جبکہ میں پورے یقین کے ساتھ محسوس کر رہا تھا کہ یہ اعتراض بالکل باطل ہے۔

۳۔ علاوہ ازیں یہ امر ہر شخص کو معلوم ہے کہ نظم کلام، کلام کا ایک جزء ہوتا ہے۔ اگر اسکو چھوڑ دیجیے تو کلام کے مفہوم و معنی کا ایک حصہ غائب ہو جائیگا۔ ترکیب میں ایک زائد حقیقت ہوتی ہے جو متفرق اجزاء کی دسترس سے بالاتر ہوتی ہے۔ انگور اور شراب ایک ہی چیز نہیں ہے۔ اس سبب سے اگر کوئی شخص فہم نظام سے محروم رہجائے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ خود کلام کی ایک بڑی حقیقت اس سے اوجھل رہ گئی اور عجب نہیں کہ وہ اہل کتاب کی اُس صف سے جاملے جس کا حال قرآن نے یوں بیان کیا ہے کہ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (پس انھوں نے ایک بڑا حصہ اس کتاب کا فراموش کر دیا جسکے ذریعہ سے انکو یاددہانی کی گئی تھی نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور جھگڑے کی آگ بھڑکا دی)۔ مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ عداوت اور بغض جسکی وبا آج مسلمانوں میں بہوٹ بڑی ہے اسی طرح کے نسیان کا نتیجہ ہو۔ اگر ایسا ہے تو اس فتنہ کا دبنا مشکل ہے۔ اسکی وجہ جیسا کہ اوپر بیان ہوئی یہ ہے کہ جب کلام الٰہی کے معانی کے باب میں ہماری رائیں مختلف ہو جائینگی تو لازماً ہماری خواہشیں اور ہمارے ارادے بھی مختلف ہو جائینگے اور ہمارا حال وہی ہو جائیگا جو اہل کتاب کا ہوا۔ صرف یہ فرق ہوگا کہ انکے لیے آخری بعثت اور آخری صحیفہ کے ذریعہ سے اصلاح حال کا موقع باقی تھا اور ہمارے لیے آخری چارہ کار صرف یہی قرآن ہے۔

تالیف و ترکیب کے یہی فوائد مقتضی ہوئے کہ انسانی فطرت کے ضعف کے سبب سے جیسا کہ وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ الآیہ کے سلسلہ میں بیان ہوا ہے، جو آیتیں بطور تخفیف کے نازل ہوئیں ان کو اپنے باب کے سابق احکام کے پہلو میں جگہ دی جائے۔ اسکی تصدیق اَلْاٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ

ضَعْفًا الآیہ سے ہوتی ہے۔ یہ آیت اپنے سابق حکم کے پہلو میں رکھی گئی ہے۔ اسی طرح سورۂ مزمل کی آخری آیت ابتدائی آیات کے بہت بعد نازل ہوئی ہے لیکن رکھی وہیں گئی جہاں اس باب کے سابق احکام موجود تھے۔ یہی حال اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ الآیہ کا ہے۔ اسی طرح آیت وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا الآیہ بعد میں تتمہ نازل ہوئی اور غایت اہتمام کی وجہ سے جیسا کہ آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں ہم نے بالتفصیل بیان کیا ہے، اپنے تتمہ کے بعد رکھی گئی۔ اس طرح کی آیات کے بعد بالعموم یہ آیت آتی ہے كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ آيَاتِهٖ لِلنَّاسِ (اور اسی طرح اللہ لوگوں کے لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت اس وعدہ کا ایفاء ہے جو اللہ تعالیٰ نے سورہ قیامہ میں فرمایا ہے ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (پھر ہمارے اوپر اسکو واضح کرنا ہے)، اور اُس دعاء کی استجابت ہے جو سورہ طٰہٰ میں مذکور ہوئی ہے رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا۔ (میرے پروردگار میرے علم کو زیادہ کر)۔

ہمارا یہ استنباط قرآن سے تھا۔ اسکی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ روایات میں ہے کہ جب کوئی آیت اُترتی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں جگہ رکھا جائے اور وہ اسی جگہ رکھی جاتی۔ اسی طرح یہ بھی روایات میں ہے کہ جب سورہ تمام ہوجاتی، حضرت جبرئیل امین آنحضرت صلعم کو پوری سورہ از سرِ نو سنا دیتے۔ ہمارے نزدیک یہی وہ جمع کرنا اور پڑھنا ہے جس کا ذکر سورہ قیامہ میں ہوا ہے اور جسکی پیروی کا آنحضرت صلعم کو حکم ہوا تھا۔

علاوہ ازیں یہ امر محتاج بیان نہیں کہ جہاں تک ترتیب آیات کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ کی منزل سے، اس بارہ میں امت کے اندر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مسلمانوں کے جس قدر فرقے ہیں، سب کے پاس قرآن مجید اسی ترتیب کے ساتھ موجود ہے۔

پھر سب سے بڑھ کر ان لوگوں کا علم و اذعان ہے جن پر حسن ترتیب کے محاسن کچھ بے نقاب ہوجاتے

ہیں اور جو ان معارف وغوامض کی کوئی تجلی دیکھ لیتے ہیں جو نظام قرآن کے اندر ودیعت ہیں۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ کتاب اللہ کے اسرار و عجائب کا کیسا عظیم الشان خزانہ ہے جس کی کلید صرف نظم ہے۔ یہ چیز ان کے ذوقِ جستجو کو شہ دیتی اور ان کی طمانیت و بصیرت میں اضافہ کرتی ہے اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ اس مخفی خزانہ کو آشکار کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس سعی کو بامراد کرتا ہے اور جتنا ان کے مقدر میں ہوتا ہے وہ اس میں سے پاتے ہیں۔ جو دروازے کھلتے جاتے ہیں ان کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوتے ہیں اور جو دروازے نہیں کھلتے ان کو اپنی قلت علم و نارسائی فہم پر محمول کرتے ہیں۔ کیونکہ معلوم ہے کہ کتاب الٰہی ایک سمندر ہے جس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ کوئی شخص آفتاب کو اپنے احاطہ میں نہیں لے سکتا۔ پس آدمی قرآن کے معاملہ میں کبھی غلطی سے مامون نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ چیز ان کے شوق و طلب کی سرگرمی کو مضمحل نہیں کرتی۔ ان کا ذوقِ جستجو برابر مشتعل رہتا ہے۔ اور جس نے بھی اس علم میں سے کوئی حصہ پایا اس نے اس نعمتِ عظمیٰ پر تحدیث کی۔ امام سیوطیؒ اپنی کتاب میں نقل کرتے ہیں۔

"وہ پہلے شخص جنھوں نے علم مناسبت (علم نظم) کو ظاہر کیا شیخ ابو بکر نیشاپوری ہیں۔ فقہ و ادب میں ان کا بڑا رتبہ تھا۔ ان کے لیے منبر رکھا جاتا جس پر بیٹھ کر قرآن کی آیتوں کی شرح کرتے۔ اور فرماتے کہ فلاں آیت فلاں آیت کے پہلو میں کیوں رکھی گئی اور فلاں سورت کے فلاں سورت کے ساتھ رکھنے میں کیا حکمت ہے، اور علمائے بغداد کی تنقیص کرتے کہ یہ لوگ نظم کے علم سے بالکل محروم ہیں۔"

امام سیوطیؒ نے ابنِ عربی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

"آیات قرآن کا ایسا باہمی تعلق کہ وہ ایک مسلسل اور مربوط کلام کے قالب میں ڈھل جائیں ایک عظیم الشان علم ہے۔ صرف ایک عالم نے اس علم سے تعرض کیا ہے۔ اسی اصول پر اس نے پوری سورہ بقرہ کو منظم کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضلِ خاص سے ہم پر یہ دروازہ

کھولا۔ لیکن ہم نے اس علم کے حامل نہیں پائے۔ ساری دنیا دوں ہمتوں اور کاہلوں سے بھری ہے۔ پس ہم نے اسکو مہر بندہی رکھا اور اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کے معاملہ کو اسی کی طرف لوٹا دیا۔"

یہی حال امام رازیؒ کا ہے۔ وہ بھی جگہ جگہ تفسیر میں اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں مخدوم مہائمی رحمۃ اللہ کی تفسیر کا موضوع ہی نظم ہے۔ انھوں نے اس نعمت کی عظمت کا جن لفظوں میں اعتراف کیا ہے اور اس کے مقابل میں اپنی بے مائیگی اور آلودگی کا جس درجہ انکو احساس ہے اسکے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اس علم کو محض فضل الٰہی کی بخشش قرار دیتے ہیں اور اسی احساس کے ماتحت انھوں نے اپنی کتاب کا نام تبصیر الرحمان وتیسیر المنان رکھا ہے۔

جن لوگوں نے اس علم میں سے کوئی حصہ پایا انکی نگاہوں میں اس کا یہ درجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اعترافات انکی زبانوں سے اسی وقت نکلے ہونگے جب انھوں نے بالیقین اسکو محسوس کر لیا ہوگا کہ قرآن مجید کی آیتیں ایک نادر اسلوب کے ساتھ مرتب ہیں جیسا کہ شیخ ولی الدین ملوی نے کہا ہے۔

"جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیتوں میں اس لیے نظم نہیں تلاش کرنا چاہیے کہ وہ مختلف وقتوں میں مختلف حالات کے ماتحت نازل ہوئی ہیں وہ غلط کہتے ہیں۔ ٹھیک بات یہ ہے کہ وہ نزول کے پہلو سے تو واقعات کے لحاظ سے ہیں لیکن ترتیب کے پہلو سے بالکل مطابق حکمت ہیں۔"

اور ظاہر ہے کہ جو شخص قرآن کے اندر اس کی جھلک پاتا ہو، اس کے جلوے دیکھتا ہو، اور اسکو اپنے دونوں ہاتھوں سے چھوتا ہو وہ اس چیز کا کیسے انکار کر سکتا ہے! ہاں جس نے اس کا مزہ ہی نہ چکھا ہو وہ اگر اس کا انکار کر دے تو کچھ قابل الزام بھی نہیں۔

جو چیز مجھے لوگوں کے سامنے لانی ہے اسکے متعلق اس طولِ بیان کی چنداں ضرورت نہیں تھی لیکن میں نے یہ تمہید اس لیے ضروری سمجھی کہ نظم کی جستجو تدبر کی محتاج ہے اور اگر تمہارے دماغ میں

یہ بات جاگزیں ہے کہ قرآن مجید میں نظم نہیں ہے تو اس رائے کے ساتھ اس دشوار گذار وادی میں ایک قدم بھی اٹھانا مشکل ہوگا۔ ہر چیز تمہیں بیگانہ معلوم ہوگی اور اس میں سر کھپانا طبیعت پر بہت بار ہوگا۔ ایک بات تم البتہ پوچھ سکتے ہو کہ اگر نظم ایسی عظیم الشان اور کثیر المنفعت چیز تھی تو آخر صحابہؓ نے اسکے متعلق کیوں سکوت اختیار فرمایا اور نبی صلعم نے اسکی توضیح کیوں نہیں فرمائی؟ ہماری طرف سے اس کا جواب ہے کہ آیات کا موقع ومحل صحابہؓ کے سامنے بالکل واضح تھا۔ وہ تمام تر انہی کے حالات اور انہی کے پیش نظر معاملات سے متعلق تھیں۔ اگر ہم بھی اس عہد میمون میں ہوتے تو ان کا نظم ہمارے لیے بھی بالکل واضح ہوتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ سے تفسیر بہت کم منقول ہے۔ زبان ان کی تھی، اسلوب ان کے تھے، اور معاملات وحالات ان کے تھے۔ ان چیزوں میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو ہمارے اور ان کے درمیان مشترک ہو، پھر نظم کے سمجھنے میں ہمارا اور ان کا حال یکساں کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن اس نمایاں فرق کے باوجود یہ ضرور ہے کہ کلام کی پیٹھ اور اس کی تہوں کے اندر ایسے اشارات موجود ہوتے ہیں جو آگے کی طرف انگلی اٹھاتے رہتے ہیں اور اگر آدمی بلیدنہ ہو بلکہ کلام کے تمام اطراف میں پھیل کر آگے بڑھے تو یہ اشارات نظم کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔

یہ ہم نے اپنی تفسیر کے ایک بنیادی اصول نظم سے متعلق کہا ہے۔ اور یہاں اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ آگے مقدمات تفسیر کے سلسلہ میں بعض مفید مطلب اشارات اور ملینگے۔ اب چند باتیں دوسرے اصول —— تفسیر آیات بالآیات —— کی نسبت لکھتے ہیں۔ علامہ سیوطیؒ اتقان میں فرماتے ہیں۔

"علماء نے کہا ہے کہ جو کتاب عزیز کی تفسیر کرنا چاہے، اسکو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے قرآن کی تفسیر قرآن سے کرے۔ قرآن میں جو چیز ایک جگہ مجمل ہے وہی چیز دوسری جگہ شرح وبسط کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ ابن جوزیؒ نے خاص اس عنوان پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں قرآن کے ان مطالب سے تعرض کیا ہے جو ایک جگہ مجمل ہیں اور دوسری جگہ مفصل۔ میں نے بھی مجمل کے باب

میں اسکی بعض مثالوں کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ اگر قرآن سے تفسیر نہ ہو سکے تو سنت رسولؐ کی طرف رجوع کرے کیونکہ سنت قرآن کی شارح اور مفسر ہے ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ کا قول ہے کہ نبی صلعم نے جو کچھ حکم فرمایا ہے سب قرآن سے ماخوذ ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىکَ اللّٰہُ (ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری ہے قول فیصل کے ساتھ تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اس چیز کے ذریعہ سے جو اللہ نے تمکو دکھائی) اس کے علاوہ اور بھی آیتیں ہیں ۔ خود نبی صلعم نے فرمایا ہے "مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اسی کے مانند ایک اور چیز بھی اس کے ساتھ" یعنی سنت[1] ۔ لیکن اگر سنت سے تفسیر نہ ہو سکے تو صحابہؓ کے اقوال کی طرف رجوع کرے انہوں نے چونکہ تمام قرائن وحالات کا بوقت نزول مشاہدہ کیا ہے نیز فہم کامل، علم صحیح اور عمل صالح سے مشرف ہیں اس لیے وہ تفسیر کے سب سے بڑے جاننے والے ہو سکتے ہیں "

اس سے مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ پہلی چیز جو قرآن کی تفسیر میں مرجع کا کام دے سکتی ہے وہ خود قرآن ہے ۔ اس کے بعد نبی صلعم اور آپ کے اصحاب کا فہم ہے ۔ پس میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے سب سے زیادہ محبوب وہی تفسیر ہے جو پیغمبر صلعم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہو ۔

بعض علماء نے اپنی کتابوں کی بنا روایات پر رکھی ہے مثلاً ابن جریر طبریؒ ۔ جنکی تفسیر کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ اسکے مثل کوئی اور تفسیر نہیں لکھی گئی، لیکن اس میں اکثر حدیثیں ضعیف ہیں ۔ مرفوع احادیث کا حصہ بہت تھوڑا ہے ۔ انہوں نے تو دراصل اہل تاویل کے اقوال تمام اختلافات کے ساتھ جمع کر دیے ہیں ۔

میں یقین رکھتا ہوں کہ صحیح احادیث میں اور قرآن میں کوئی تعارض نہیں ہے تاہم میں روایات کو بطور اصل نہیں بلکہ بطور تائید کے پیش کیا کرتا ہوں ۔ پہلے آیت کی تاویل مماثل آیات سے کرتا ہوں ۔ اسکے

[1] "مثلہ معہٗ" کی یہ تفسیر امام شافعیؒ نے فرمائی ہے ۔ مگر ہمارے نزدیک اس سے مراد فہم و بصیرت اور وہ روشنی ہے جس سے
[illegible]

بعد تبعاً احادیث صحیحہ کا ذکر تا ہوں تاکہ ان منکرین کو معارضہ کی راہ نہ ملے جنھوں نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا ہے اور وہ ملحدین کوئی اعتراض نہ کرسکیں جو ہمارے سر ایسی چیزیں تھوپتے ہیں جنکی قرآن میں کوئی اصل نہیں ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام فرق کے درمیان ایک حجت قاطع اور مرکز جامع کی حیثیت سے کام دے۔

میری یہ خواہش نہیں ہے کہ جو کچھ قرآن سے تعلق رکھتا ہے وہ سب کا سب اس کتاب میں جمع کردوں۔ قرآن مجید ایک ایسا خزانہ ہے جو طالبوں کی کثرت کے باوجود کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ تفسیر کی کتابیں بہت ہیں۔ جو شخص انکو بنگاہِ تحقیق دیکھیگا وہ اس علم میں سے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق حصہ پائیگا۔ میرے پیشِ نظر تو ایک ایسی کتاب کی تالیف ہے جو بنیاد اور مرکز کا کام دے اور نقطۂ اعتدال اور قول فیصل کی حیثیت سے نمودار ہو۔ اس لیے میں نے صرف اُتنے ہی پر اکتفا کیا ہے جتنا قرآن میں ہے۔ لیکن اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ جو کچھ میں نے چھوڑ دیا ہے اس کا منکر ہوں۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں وہ روایتیں جمع کیں جو انکے اصول پر پوری اُتریں اور بہت سی صحیح روایتیں چھوڑ دیں۔ اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ انکے منکر ہیں۔ بلکہ میں تو اپنی اس کتاب میں ان حقائق و معارف کا عشر عشیر بھی نہیں بیان کرسکا جو خود قرآن کے اندر مستور ہیں لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو میں ان کے لیے ایک علیحدہ کتاب لکھوں گا اور اس میں حتی الامکان ان معارف کو سمیٹنے کی کوشش کروں گا وھو الملھم للحق والصواب۔

قرآن کے پورے تمسک کے ساتھ ساتھ جس طرح میں روایات کو تبعاً ذکر کرتا ہوں اسی طرح ان کتابوں کی شہادتیں بھی پیش کرتا ہوں جو قرآن سے بیشتر نازل ہوئی ہیں اور اس سے مقصود قرآن کے ساتھ انکی موافقت کو دکھانا اور یہود و نصاریٰ پر خود انکی کتابوں سے حجت پیش کرنا ہے۔ دیباچۂ کتاب میں اتنی تفصیل کافی ہے، لیکن بعض امور مہمہ ایسے ہیں جنکے ذکر کی ضرورت باقی ہے۔ تو ان

سکے لیے ان مقدمات میں جگہ نکالی ہے جو تفسیر کے شروع میں لکھ رہے ہیں تاکہ اثنائے تفسیر میں جہاں ضرورت پیش آسکے ان کا حوالہ دیدیا جائے اور انکی بار بار کی تکرار سے سلسلہ کلام میں کوئی برہمی نہ پیدا ہو۔ پوری کتاب ۱۱۴ اقساط میں ہے۔ ہر سورہ کے لیے ایک قسط مخصوص ہے۔ یہ جو کچھ بھی لکھ سکا ہوں سب اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے اور تمام فضل و احسان کا سرچشمہ اسی کی ذات ہے۔ اگر میں نے کوئی صحیح بات کہی ہے تو اسکا لطف و کرم ہے والا فکان کما کانت حاجۃ فی نفس یعقوب قضاہا۔

مقدمہ (۱)

شان نزول

شان نزول کا مطلب، جیسا کہ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھا ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ کسی آیت یا سورہ کے نزول کا سبب ہے۔ بلکہ اس سے مراد لوگوں کی وہ حالت و کیفیت ہے جس پر اس کلام کا برمحل اطلاق ہوتا ہے۔ کوئی سورہ ایسی نہیں ہے جس میں کسی خاص امر یا امور کو مدنظر رکھے بغیر کلام کیا گیا ہو اور وہ امر یا امور جنکو کسی سورہ میں مدنظر رکھا گیا ہے، عمود سورہ ہی کے تحت مندرج ہوتے ہیں۔ لہذا اگر تم کو شان نزول معلوم کرنی ہو تو اسکو خود سورہ سے معلوم کرو۔ کیونکہ کلام کا اپنے موقع و محل کے مناسب ہونا ضروری ہے۔ جس طرح ایک ماہر طبیب دوا کے نسخہ سے اس شخص کی بیماری معلوم کر سکتا ہے جسکے لیے نسخہ لکھا گیا ہے اسی طرح تم سورہ سے سورہ کا شان نزول خود معلوم کر سکتے ہو۔ اگر کلام میں کوئی خاص موضوع پیش نظر ہے تو اس کلام اور موضوع میں وہی مناسبت ہوگی جو مناسبت لباس اور جسم میں بلکہ جلد اور بدن میں ہوتی ہے۔ اور یہ قطعی ہے کہ کلام کے تمام اجزا باہمدگر مربوط و متصل ہوں گے۔ اور یہ جو روایتوں میں آتا ہے کہ فلاں فلاں آیتیں فلاں فلاں معاملات کے بارہ میں نازل ہوئیں تو اسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ سورہ کے نزول کے وقت یہ یہ احوال و مسائل درپیش تھے تاکہ معلوم ہو کہ سورہ کے نزول کے لیے کیا محرکات اور دواعی موجود تھے۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں۔

"زرکشیؒ نے برہان میں لکھا ہے کہ صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم کی یہ عام عادت ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں بارہ میں نازل ہوئی تو اسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ آیت اس حکم پر مشتمل ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بعینہ وہ بات اس آیت کے نزول کا سبب ہے۔ یہ گویا اس حکم پر اس آیت سے ایک قسم کا استدلال ہوتا ہے، اس سے مقصود نقل واقعہ نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں اسباب نزول میں ایک قابل لحاظ چیز یہ بھی ہے کہ ضروری نہیں کہ آیت اُسی زمانہ میں نازل ہوئی ہو جس زمانہ میں واقعہ پیش آیا"

زرکشیؒ کے اس بیان سے وہ مشکل حل ہو جاتی ہے جس کا ذکر امام رازیؒ نے سورۂ انعام میں وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا الآیہ کی تفسیر کے ذیل میں کیا ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

"مجھے یہاں ایک سخت اشکال پیش آیا ہے۔ وہ یہ کہ لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ یہ پوری سورہ بیک دفعہ نازل ہوئی تھی۔ اگر صورت معاملہ یہ ہے تو پھر ہر آیت کے بارہ میں یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ اسکا سبب نزول فلاں واقعہ ہے"

پس ہمارے نزدیک، جیسا کہ اوپر کے مباحث سے واضح ہوا، صورت معاملہ یہ ہے کہ جس وقت جو سورۃ بھی نازل کی گئی ہے اس غرض کے لیے نازل کی گئی ہے کہ جو معاملات محتاج توضیح وتشریح ہیں اُن کی توضیح وتشریح کر دی جائے اور کلام ایسا ہو کہ اس کے نظم میں کسی قسم کا التباس وابہام نہ ہو۔ جس طرح ایک ماہر اور حکیم خطیب اپنے سامنے کے خاص حالات ومقتضیات کی بنا پر ایک خطبہ دیتا ہے کہ بسا اوقات وہ ایک خاص معاملہ کا ذکر نظر انداز کر دیتا ہے لیکن اس کا کلام اُس طرح کے تمام احوال ومعاملات پر حاوی ہوتا ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص معاملہ یا کسی خاص شخص کا ذکر کرتا ہے لیکن کلام ایک عالمگیر بارش کی طرح بالکل حاوی وہمہ گیر ہوتا ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم کا نزول بھی ہوا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید سے خود مترشح ہوتا ہے۔ فرمایا وَاِنْ تَسْئَلُوا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ "اور اگر تم ان کے متعلق ایسے وقت میں سوال کرو گے جبکہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو وہ ظاہر کر دی جائینگی" اس سے معلوم ہوا کہ قرآن عین اپنے وقت نزول میں سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے، لوگوں کے سوالوں کے جواب دیدیتا تھا۔ اس طرح جب ایک سورہ اپنی حد کو پہنچ جاتی اور کلام کے تمام دواعی و مقتضیات پورے ہو جاتے تو وہ سورۃ تمام کردی جاتی اور ناممکن تھا کہ وہ اپنے حدود اقتضار سے ذرا بھی کم و بیش ہو۔ لیکن بسا اوقات ضرورت باقی رہ جاتی تھی۔ اس وقت دوسری سورۃ نازل کی جاتی۔ شان نزول وہی ہوتا لیکن اسلوب میں تبدیلی کردی جاتی کہ یکسانی و یکرنگی ذوق پر بار نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے بعثت کی بہت سی سورتوں میں بعث، توحید، تصدیق رسول اور اس سے ملتے جلتے ہوئے مضامین ملتے ہیں۔ صرف اسلوب اور طرز بیان کا فرق ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا کہ ضرورت کسی امر کی توضیح و تشریح کی داعی ہوتی، اس وقت کوئی آیت اترتی اور جہاں ضرورت ہوتی وہیں رکھدی جاتی۔ یہ اس وعدہ کی تکمیل ہوتی جس کا ذکر سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے۔ ثم ان علینا بیانہ (پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی توضیح کرنا) ایسے مواقع پر زمانہ نزول کا لحاظ نہ ہوتا بلکہ نظم کلام کا لحاظ کیا جاتا۔ اور بالعموم اس قسم کی آیات کے بعد یہ تنبیہ بھی کردی جاتی کہ یہ آیت بطور تشریح نازل ہوئی ہے چنانچہ جو آیتیں اصل احکام کے ساتھ بطور تفسیر ملائی گئی ہیں ان کے بعد بالعموم، جیسا کہ ہم نے دیباچہ میں ذکر کیا ہے، یہ آیت آئی ہے۔ کذلک یبین اللہ آیاتہ للناس لعلھم یتقون۔

پس اگر تم طمانیت اور یقین کے طالب ہو تو شان نزول کی تلاش میں سر رشتہ نظم کو ہرگز ہاتھ سے نہ چھوڑنا ورنہ تمہاری مثال صحرا کے اس مسافر کی ہوگی جو اندھیری رات میں ایک چوراہے پر پہنچ گیا ہے اور نہیں جانتا کہ اب کدھر جائے۔ شان نزول خود قرآن کے اندر سے اخذ کرنا چاہیئے اور

احادیث و روایات کے ذخیرہ میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہئیں جو قرآن کی تائید کریں نہ کہ اس کے تمام نظام کو درہم برہم کردیں۔ پھر سب سے زیادہ لایق اہتمام چیز وہ شان نزول ہے جو نظم سے مترشح ہوتا ہو۔ اس کو پوری مضبوطی سے پکڑو۔ کیونکہ جب کوئی حکم عام کسی خاص حالت و صورت میں نازل ہوتا ہے تو وہ حالت و صورت حکم کی حکمت و علت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مثلاً قرآن میں تعدد ازواج اور وحدت ازواج کا حکم ہے۔ اب اگر تم اس شان نزول کو سامنے رکھو جو نظم کلام سے نکلتا ہے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ پہلا حکم یتامیٰ کے ساتھ انصاف کے مقصد سے ہے اور دوسرا حکم بیویوں کے ساتھ انصاف کے مقصد سے ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان جامع رشتہ قسط بالضعفاء ہے، اور ان میں سے ترجیح اس حق کو ہوگی جو مقدم ہے۔ یہی حال رہن کے معاملہ کا ہے۔ کسی مسلمان کا مال گرو رکھنا ایک نہایت دنارت کی بات ہے۔ پس ضرورت کے لیے اسکی اجازت دی اور ضرورت رفع ہو جانے کے بعد اسکے لوٹا دینے کا حکم دیا۔ اس اجمالی اشارہ کی تفصیل بقرہ کی آیت ۲۸۳ کے ماتحت ملیگی۔

مقدمہ (۲)

تفسیر کے خبری ماخذ

بعض ماخذ اصل و اساس کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض فرع کی۔ اصل و اساس کی حیثیت تو صرف قرآن کو حاصل ہے اسکے سوا کسی چیز کو حاصل نہیں ہے۔ باقی فرع کی حیثیت سے تین ہیں۔ (۱) احادیث (۲) قوموں کے ثابت شدہ اور متفق علیہ حالات (۳) گذشتہ انبیاء کے صحیفے جو محفوظ ہیں۔ اگر احادیث، تاریخ اور قدیم صحیفوں میں ظن اور شبہ کو دخل نہ ہوتا تو ہم ان کو فرع کے درجہ میں نہ رکھتے بلکہ سب کی حیثیت اصل کی ہوتی اور سب بلا اختلاف ایک دوسرے کی تائید کرتے۔ پس جو شخص قرآن مجید کو سمجھنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ روایات کے ذخیرہ

میں سے اُن روایات کو نہ لے جو اصل کو ڈھاتی ہوں۔ بعض روایتیں ایسی ہیں جنکی اگر تاویل نہ کی جائے تو انکی زد براہ راست اصل پر پڑتی ہے اور اُن سے سلسلہ نظم درہم برہم ہوتا ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ بہت سے لوگ آیت کی تاویل کر ڈالتے ہیں لیکن روایت کی تاویل کی جرأت نہیں کرتے اور بسا اوقات تو صرف آیت کی تاویل ہی پر بس نہیں کرتے بلکہ اسکے نظام کی بھی قطع و برید کر ڈالتے ہیں حالانکہ جب اصل و فرع میں تعارض ہو تو کاٹنے کی چیز فرع ہے نہ کہ اصل۔

وکاین رأینا من فروع طویلۃ　　　　تموت اذا لم تحیہن اصول

اور سب سے زیادہ تعجب ان لوگوں پر ہے جو ایسی روایات تک قبول کر لیتے ہیں جو نصوص قرآن کی تکذیب کرتی ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جھوٹ بولنے کی روایت، یا آنحضرت صلعم کے خلافِ وحی قرآن پڑھ دینے کی روایت۔ اس طرح کی روایات کے بارہ میں ہم کو نہایت محتاط ہونا چاہیے۔ صرف وہ روایتیں قبول کرنی چاہئیں جو قرآن کی تصدیق و تائید کریں۔ مثلاً جو آثار حضرت ابنِ عباسؓ سے منقول ہیں وہ بالعموم نظم قرآن سے بہت اقرب ہیں۔ پس اس طرح کی روایات کی طرف ہم تبعاً اشارہ کرینگے۔ اسی طرح اہل کتاب کی جو روایات ہمارے ہاں پھیلی ہوئی ہیں اُن کے مقابل میں خود اہل کتاب کی تاریخ قابل ترجیح ہے کیونکہ مفسرین نے بالعموم یہ روایتیں عوام کی زبانی لی ہیں جو بنی اسرائیل اور ان کے انبیاء کی تاریخ سے بہت کم واقف تھے۔ پس بہتر یہ ہے کہ اُن کے بے اصل افسانوں کے بجائے اُن کی معتبر کتابوں کو ہم ماخذ بنائیں اور ان کو تبع کی حیثیت سے پیش کریں، اور جہاں کہیں وہ قرآن سے مختلف ہوں وہاں انکو چھوڑ دیں کیونکہ یہ قطعی معلوم ہے کہ ان کتابوں میں شہادت کو چھپایا گیا ہے۔ نیز ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "ءانتم اعلم ام اللہ" تم زیادہ جانتے ہو کہ اللہ؟ اس طرح کے کتم و تحریف کی نہایت واضح مثال حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کے معاملہ میں موجود ہے۔ پس لازماً جو کچھ قرآن میں ہے ہم اسی کو اصل قرار دینگے

اس اصول میں کسی کے لیے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم مسلمان آسمانی کتابوں میں کسی قسم کی تفریق جائز نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک قرآن انہی میں سے ایک ہے البتہ جب روایت میں اختلاف ہوگا تو ہم کو صحت روایت کے لیے اہتمام کرنا پڑے گا اور اس وقت ہم مجبوراً اسی روایت کو ترجیح دینگے جو سب سے زیادہ صحیح اور معتبر ثابت ہو۔ ہاں اگر باہمدگر کوئی اختلاف نہ ہو تو ہم روایت کی کسوٹی پر جانچ کر ان کتابوں سے بھی لے سکتے ہیں جنکا از روئے روایت کوئی وزن نہیں ہے۔ مثلاً ہم زبور میں سے اس چیز کو لیں گے جسکی طرف قرآن کریم نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ۔	ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھدیا ہے کہ زمین کے وارث ہمارے نیکوکار بندے ہوں گے۔

اور صحف موسیٰ میں سے اس چیز کو اخذ کرینگے جسکی طرف آیت ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے۔

إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ۔	یہ اگلے صحیفوں میں ہے، ابراہیم و موسیٰ کے صحیفوں میں۔

اسی طرح مندرجہ ذیل قبیل کی آیات کی توضیح کے لیے ہمیں بنی اسرائیل کی تاریخ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا:۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ۔	اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے فیصلہ کی اطلاع دیدی تھی کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد برپا کرو گے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن مجید اپنی تفسیر کے لیے ان فروع کا محتاج نہیں ہے وہ تمام کتابوں کے لیے خود مرکز و مرجع کی حیثیت رکھتا ہے اور جہاں اختلاف واقع ہو تو اسی کی روشنی جھگڑے کو چکانے والی ہوگی۔ لیکن اگر تم کو قرآن مجید کی تصدیق و تائید کی ضرورت ہو تو ان فروع

کی مراجعت سے تمہارے ایمان اور طمانیت میں اضافہ ہوگا۔ یہی حکمت ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ حکم دیا ہے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ۔ کہدو ملک میں سیاحت کرو اور دیکھو منکروں کا انجام کیسا ہوا۔

بہرحال جو لوگ اگلے صحیفوں کی مراجعت کرینگے ان کو گوناگوں فوائد حاصل ہوں گے مثلاً ان صحیفوں کے مقابل میں قرآنی تعلیم کی فضیلت واضح ہوگی، اپنی کتابوں میں سے جو کچھ انہوں نے بھلا دیا ہے قرآن کی رہنمائی سے ان کا اعادہ ہوگا، جو کچھ انھوں نے بدل ڈالا ہے اسکا انکشاف ہوگا۔

ایک اور قابل لحاظ اصل یہ ہے کہ قرآن سے جو کچھ ثابت ہو اس میں اور فروع سے جو کچھ معلوم ہو اس میں فرق کرنا چاہیے۔ دونوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ قطعی ثابت ہے اور فروع میں وہم وظن کے لیے بہت کچھ گنجائش ہے۔ پس اگر کوئی شخص فروع میں سے کسی بات کا منکر ہو تو وہ قرآن کے منکر کی طرح نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ خبر اگرچہ متواتر ہو، قرآن کو نہیں منسوخ کر سکتی۔ اسکی یا تو تاویل کرینگے یا اس میں توقف کرینگے لیکن اس کے لیے قرآن کو منسوخ نہیں کرینگے۔ امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور عام اہل حدیث، حدیث کو قرآن کے لیے ناسخ نہیں مانتے اگرچہ حدیث متواتر ہو۔ پس جب یہ ائمۂ حدیث کے لیے صاحب البیت کی حیثیت رکھتے ہیں اس بات کے قائل نہیں ہوئے تو اس باب میں ہم فقہاء و متکلمین کی رائے کو کوئی وزن نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اس فتنہ سے امان میں رکھے کہ ہم اس بات کے قائل ہوں کہ رسول، اللہ کے کلام کو منسوخ کر سکتا ہے۔ اس طرح کے مواقع میں تمام تر راویوں کے وہم اور ان کی غلطی کو دخل ہے اور فریقین کے دلائل پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ حق کیا ہے۔ یہ مقام اس مسئلہ کی تفصیل

سے کے لیے موزوں نہیں ہے اس لیے اسی پر بس کرتے ہیں۔ سترہویں مقدمہ میں اسکی کسی قدر توضیح ملے گی۔

مقدمہ (۳)

تفسیر کے لسانی ماخذ

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ وہ متن قرآن کی حفاظت کرے گا: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (ہم نے ذکر کو اتارا ہے اور ہم ہی اسکی حفاظت کرنیوالے ہیں) اسی طرح اسکی تشریح و بیان کا بھی وعدہ فرمایا ہے: ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (پھر ہمارے ذمہ ہے اس کی وضاحت کرنا)۔ چنانچہ یہ اسی وعدہ کا ایفا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربی زبان کو مٹنے سے محفوظ رکھا اور اس کو ایک زندہ و قائم زبان بنا دیا۔ اسی طرح تمام اصطلاحات شرعیہ مثلاً نماز، زکوٰۃ، جہاد، روزہ، حج، مسجد حرام، صفا، مروہ اور مناسک حج وغیرہ اور ان کے ساتھ جو اعمال متعلق ہیں، متواتر و توارث کے ساتھ، سلف سے لیکر خلف تک سب محفوظ رہے ہے۔ اس میں جو معمولی جزوی اختلافات ہیں وہ بالکل ناقابل لحاظ ہیں۔ شیر کے معنی سب کو معلوم ہیں، اگرچہ مختلف ممالک کے شیروں کی شکلوں اور صورتوں میں کچھ نہ کچھ اختلافات ہیں۔ اسی طرح جو نماز مطلوب ہے وہ وہی نماز ہے جو مسلمان پڑھتے ہیں، ہر چند کہ اسکی ہیئت میں بعض جزئی اختلافات ہیں۔ جو لوگ اس طرح کی چیزوں میں زیادہ کرید و کریزی سے کام لیتے ہیں وہ اس دین قیم کے مزاج سے بالکل ناواقف ہیں جسکی تعلیم قرآن پاک نے دی ہے۔ یہ قرآن پاک ہی کی تعلیم ہے کہ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (خدا تک تمہاری قربانیوں کے گوشت اور خون نہیں پہنچ سکتے بلکہ تمہارا تقویٰ ہی اس تک پہنچ سکتا ہے)۔ پس جو لوگ اس طرح کے امور میں زیادہ کرید کرتے ہیں وہ ان یہود کے نقشِ قدم کی پیروی کرتے ہیں جنہوں نے اپنے دین میں اختلاف ڈالا اور

شبہات میں پڑے - ان لوگوں کی اصلی حالت کی تصویر قرآن نے اس جگہ کھینچی ہے جہاں ان کے گائے ذبح کرنے کا واقعہ بیان کیا ہے - پیغمبر بار بار کہہ رہا ہے کہ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ (جو حکم دیا جا رہا ہے اسکی تعمیل کرو) لیکن وہ برابر سوال پر سوال کیے چلے جا رہے ہیں - اور اسکے بعد بھی شاید ذبح کی توفیق نہ ہوتی لیکن "ان شاء اللہ" کی برکت نے ان کو ایک عظیم فتنہ سے بچا لیا - چنانچہ قرآن نے ان کے حق میں یہ الفاظ فرمائے، وما کادوا یفعلون، اور قریب تھا کہ وہ نہ کرتے -

پس جب ایسے الفاظ مصطلحہ کا معاملہ پیش آئے جنکی پوری حد اور تصویر قرآن میں بیان نہ ہوئی ہو تو اخبار احاد پر جامد نہیں ہونا چاہیے ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شک میں پڑو گے، دوسروں کے اعمال کو غلط ٹھہراؤ گے، ان سے جھگڑو گے اور تمہارے درمیان کوئی چیز ایسی نہیں ہوگی جو اس جھگڑے کا فیصلہ کر سکے - ایسی صورتوں میں راہ عمل یہ ہے کہ جتنے حصہ پر تمام امت متفق ہے اتنے پر قناعت کرو اور جن چیزوں کے بارہ میں کوئی نص صریح اور متفق علیہ عمل ماثور موجود نہیں ہے ان میں اپنے دوسرے بھائیوں کا تخطیہ نہ کرو - جہاں تک اصطلاحات شرعیہ کا تعلق ہے، قرآن کی اس وسیع شاہراہ پر چلنا چاہیے -

باقی رہے دوسرے الفاظ اور انکے اسالیب حقیقت و مجاز تو اس باب میں ماخذ قدیم کلام عرب اور خود قرآن مجید ہے - لغت کی کتابیں اس معاملہ میں مقصر ہیں - ان میں بالعموم نہ تو الفاظ کی حد تام معلوم ہوتی، نہ عربی خالص و مولّد کے درمیان کوئی امتیاز قائم اور نہ لفظ کی جڑ ہی کا پتہ لگتا کہ معلوم ہو سکے کہ کیا اصل ہے کیا فرع، اور کیا حقیقت ہے کیا مجاز - تو جو لوگ کلام عرب کی ممارست نہیں بہم پہنچاتے، صرف لغت کی کتابوں پر قانع ہو جاتے ہیں وہ بسا اوقات قرآن مجید کے معانی سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں - پھر قدیم کلام عرب کا جتنا حصہ ہم تک پہنچا ہے اس میں بہت کچھ منحول اور شاذ کی بھی آمیزش ہے لیکن ایک ناقد ماہر کے لیے اصل و نقل میں امتیاز کرنا کچھ مشکل نہیں ہے - پس ضروری ہے

کہ صرف وہ معنی لیے جائیں جو صحیح و ثابت سے ماخوذ ہوں اور شاذ معنی ہرگز نہ لیے جائیں۔ مثلاً بعض لوگوں نے تمنی کے معنی تلاوت کے لے لیے۔ اس طرح کے غیر ثابت اور شاذ معانی کی طرف جو لوگ گئے ہیں محض بعض اشکالات سے بچنے کے لیے گئے ہیں۔ حالانکہ یہ بجائے خود ایک بہت بڑا فتنہ اور اختلاف امت کا دروازہ ہے۔ جو شخص اصلی شاہراہ کو چھوڑ کر چلے گا اسکے لیے ناگزیر ہے کہ وہ مختلف وادیوں میں ٹھوکریں کھائے۔

اسکے علاوہ جو دوسرے علوم زبان ہیں مثلاً نحو، منطق، اصول، بیان، بلاغت، قافیہ، تو ان میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، اپنے فوائد کی کثرت کے باوجود، فہم قرآن کے لیے کتب لغت سے بھی زیادہ مختصر ہیں۔ موجودہ فن نحو بہت اضافہ کا محتاج ہے۔ یہ صرف متوسط درجے کے کلام کے لیے اصول فراہم کرتا ہے۔ پس مفسر کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ کلام الٰہی کو موجودہ اصول نحو پر بہت زیادہ منطبق کرنے کی کوشش کرے۔ اس طرح کی کوشش کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کو کلام الٰہی میں ایسی ترمیم و تاویل کرنی پڑیگی جس سے ایک دیکھنے والے کو یہ گمان ہوگا کہ قرآن مجید زبان کی عام شاہراہ سے بالکل الگ ہے۔ بلکہ اسکو کلام عرب سے وہ شہادتیں فراہم کرنی چاہئیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن ہی کا اسلوب زبان کا اصلی اور اعلیٰ اسلوب ہے۔

منطق میں تمام تر مدار تحدید و نفی اور استثناء وغیرہ کے الفاظ کے استعمال میں تدقیق پر ہے اس لیے "علم آدم الاسماء کلها" اور "وما منعنا ان نرسل بالآيات الا ان كذب بها الاولون" وغیرہ اسالیب میں جو دلیلیں پنہاں ہیں وہ اس کی گرفت سے باہر ہیں۔ ہم اس کے متعلق ایک دوسرے مقدمہ میں مفصل گفتگو کرینگے۔

علم البیان کا حال بالکل نحو کا حال ہے۔ جو کلام ایک زندہ قلب کے اندر سے اُبلتا ہے یہ علم اس سے بھی تعرض کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو آسمان وحی سے برسنے والا کلام اسکی تنگنا سے

میں کیا سما سکتا ہے! صاحب وحی بلکہ ہر داعی حق کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب حالات داعی ہوتے ہیں اسکے قلب کے اندر سے ایک چشمہ اُبلتا ہے ۔ وہ کبھی مجاز کے رنگ میں گفتگو کرتا ہے، کبھی حقیقت کے بھیس میں، لیکن ہر صورت میں اپنی مخاطب جماعت کی فہم اور اپنی زبان کے طریقوں کی رعایت کرتا ہے ۔ وہ باپ اور بیٹے کے الفاظ استعمال کرتا ہے، اپنے جسم کو مختلف جسموں میں بانٹتا ہے، اپنا گوشت وخون دوسروں کو کھلاتا ہے، ید، ساق، وجہ، عرش، کرسی وغیرہ کلمات اپنی گفتگو میں لاتا ہے، بسط وقبض، طی ونشر، حسرت و انتقام اور غضب و محبت وغیرہ الفاظ استعمال کرتا ہے اور اس کے مخاطب ان کو بے تکلف سمجھتے ہیں ۔ البتہ جو شخص علم بیان کی زنجیروں میں اپنے تئیں جکڑ لے گا وہ چیونٹی کی طرح چلیگا اور اندھوں کے مانند ٹھوکریں کھائے گا ۔ زبور اور صحف انبیاء کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ آسمانی کلام میں مجاز کو کس قدر دخل ہوتا ہے ۔

فن اصول کے متعلق ہم ان لوگوں کی خدمت کا اعتراف کرتے ہیں جنھوں نے اس کی بنا ڈالی ۔ بے شبہ یہ فن ایک ایسا فن ہے جس کو انھوں نے یونانیوں، ہندوستانیوں یا کسی اور قوم سے نہیں لیا ہے بلکہ ضرورت داعی ہوئی کہ یہ ایسے اصول بنائیں جو کتاب و سنت سے احکام کے استنباط کے لیے ضابطہ کا کام دیں ۔ پس اس فن کے یہ لوگ بانی اور اس میں دوسروں کے امام ہیں ۔ لیکن اس بات کا نہایت افسوس ہے کہ بعد والوں کو اسکی تہذیب و اصلاح کی توفیق نہیں ہوئی ۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا پورا نظام کمزور اور پس پسار رہگیا اور وہ ربط و نظم اس میں نہیں پیدا ہو سکا کہ اس کو فن کا نام دیا جاسکے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں اختلافات بہت ہیں جو بالآخر احکام کے اختلاف کا سبب ہوتے ہیں ۔ نحو اور منطق وغیرہ فنون کا یہ حال نہیں ہے ۔ یہاں شدید ضرورت سے ہم نے یہ چند سطریں لکھی ہیں ۔ اس سے زیادہ کی گنجایش نہیں ہے ۔ شاید اللہ تعالیٰ مجھے اس فن کو مرتب کرنے کی توفیق بخشے ۔

فن بلاغت کو لوگوں نے اشعار سے مستنبط کیا ہے اور اشعار کا دائرہ معلوم ہے کہ وہ صرف وزن و بیت کی خوبیوں، الفاظ کی نزاکتوں اور بدیع کی صنعت کاریوں تک محدود ہے۔ باقی رہے حسنِ استدلال کے پہلو، ربط معانی کے مختلف انداز، ضرب امثال، قصص سے عبرت پذیری کے مختلف ڈھنگ، کلام کا بڑھ کر اپنے مرکز کی طرف لوٹنا، زجر اور عتاب، متکلم کی شدت یقین کا اظہار، ترفعاً اعراض، ناصحانہ اظہار حسرت وغیرہ جنکی مثالیں صرف خطباء کے کلام اور انبیاء علیہم السلام کی وحی میں مل سکتی ہیں، ہمارے فن بلاغت نے انکو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔ خطبائے عرب کا کلام ان لوگوں کو ملا نہیں، خطبائے عجم کے کلام پر انھوں نے غور نہیں کیا۔ چنانچہ باقلانیؒ نے باوجودیکہ بلاغت قرآن کو بے نقاب کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر ڈالا ہے لیکن استناد کے لیے تمام تر اشعار پر اعتماد کیا ہے۔ خطبات کے صرف تھوڑے سے نمونے دیدیے ہیں تاکہ مقابلہ کر کے تم خود کچھ فرق معلوم کر لو۔ باقی وہ دس امور، جنکا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، جن میں سے پانچ عقلی ہیں، پانچ نفسی، تو ان کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ امور ایسے نہیں ہیں جو کسی ایک زبان کے ساتھ مخصوص ہوں بلکہ تمام زبانوں میں عام ہیں اس لیے کلام سے ان پر شہادتیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ قرآن مجید خود ان کے اوپر دلیل ہے۔

پھر موجودہ علم بلاغت اسالیب کلام کی معرفت کے لیے بھی کوئی قیمتی رہنمائی اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اس فن کے مصنفین عموماً عجمی ہیں اور اہل عجم کیلئے عرب کے انداز و اسالیب پر غور کرنا اور ان کو سمجھنا نہایت مشکل ہے۔ پس بجائے اسکے کہ انکی کوتاہیوں اور نارسائیوں کی شکایت کی جائے، جو تھوڑی بہت خدمت انھوں نے اس فن کی کی ہے اس پر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ یہ کیا کم ہے کہ بعض جگہ ان کا تیر نشانہ پر لگا ہے اور بعض جگہ اگر نشانہ پر نہیں لگا ہے تو اسکے قریب پہنچا ہے۔ اپنا مقصد واضح کرنے کے لیے میں ایک علٰحدہ مقدمہ میں بعض ایسے اسالیب کا ذکر

کروں گا جو عربی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں اسی طرح قوانی قرآن اور اس کے کلمات کے انسجام کے متعلق بھی علحدہ گفتگو کروں گا۔[1]

مقدمہ (۴)

کتب منزلہ کی شرح ایک دوسرے کی مدد سے

یہاں میرا مقصد صرف اس شرح و توضیح سے ہے جس کا تعلق زبان اور اسالیب بیان سے ہے باقی احکام و اخبار کے متعلق ایک دوسرے مقدمہ میں گفتگو کروں گا۔

یہ معلوم ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا کلام جسکی روایت یونانی زبان میں ہوئی، در اصل عبرانی میں تھا۔ انجیل اور توریت کی زبان ایک ہی ہے۔ اور یہ امر بھی ہر شخص کو معلوم ہے کہ عربی اور عبرانی جو کتب منزلہ کی زبان ہیں، دونوں ایک ہی اصل سے نکلی ہیں۔ ایسی صورت میں ناگزیر ہے کہ ان دونوں میں نہایت گہری مماثلت و مشابہت ہو اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے معانی کی طرف رہبری کرے۔ پھر ان تمام صحیفوں کے مطالب بھی ایک سے ہیں۔ یہ سب وحی کے پاک سرچشمے سے نکلی ہیں اس لیے بھی ان میں یکسانی و ہمرنگی قدرتی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ جو امور اہل کتاب پر مشتبہ رہ گئے، قرآن ہمارے لیے انکی تفصیل کرے گا۔ پس ان امور کا جاننا بھی فائدہ سے خالی نہیں۔ نیز قرآن مجید کتب منزلہ کا مصدق ہے تو ان کی باہمی موافقت اور سازگاری از دیاد ایمان و طمانیت کا باعث ہوگی۔ پھر قرآن مجید جھگڑے کو چکانے والی اور اختلافات کو رفع کرنے والی کتاب بنکر نازل ہوا ہے اور اسکے ماسوا اکثر کتب منزلہ تخیل و شعر ہیں لہٰذا جو لوگ ان کتابوں کو سمجھنا چاہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کو قرآن کی روشنی میں سمجھیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ یہ پرانے صحیفے متروک ہو چکے ہیں اس وجہ سے ان کی زبان مٹ چکی ہے۔ اب

[1] ان مسائل پر تفصیلی بحث اس مقدمہ کے بجائے مولانا نے جمہرہ میں کی ہے۔ اسکو دیکھنا چاہیے (مترجم)

اگر کوئی شخص ان کو سمجھنا چاہے تو اسکے لیے صرف ایک ہی شکل ہے کہ انہیں لغت قرآن کی رہنمائی سے سمجھے۔ ان باتوں کی طرف میرا ذہن اس لیے گیا کہ میں جانتا ہوں، انجیل اور توریت کی بہت سی باتیں، ان کے ماننے والوں کے لیے فتنہ بنگئیں۔ حالانکہ اگر وہ عربی زبان جانتے ہوتے تو اس گمراہی میں نہ پڑتے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ آدمی لفظوں سے ہلاک ہوتا ہے اور معانی سے نجات پاتا ہے۔ یہ لوگ الفاظ پر جم گئے اس لیے ان پر ہدایت کی راہ باز نہ ہوئی۔ اسی سے ملتا جلتا حال مسلمانوں کا ہے۔ بعض مسلمان انجیل کی بعض عبارتوں کا مذاق اڑاتے ہیں حالانکہ اگر وہ قرآن کی تعلیم سے انکو مطابقت دے سکیں تو انکو معلوم ہو کہ ان باتوں کے ماننے کی سب سے بڑی ذمہ داری مسلمانوں ہی پر ہے۔ قرآن میں ہم کو متشابہات پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے ہم کوئی وجہ نہیں دیکھتے کہ آخر یہ حکم دوسری آسمانی کتب کے متعلق بھی کیوں نہ ہو۔ قرآن مجید میں صاف ہے کہ اگر ایک شخص ایک بات کی تاویل نہ جاننے کی وجہ سے اس کا انکار کردے تو وہ سخت گنہگار ہے۔ بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بعلمه ولما یاتهم تاویله كذلك كذب الذين من قبلهم فانظر كيف كان عاقبة الظالمين۔ (بلکہ انھوں نے اس چیز کا انکار کیا جو اُنکے علم کے دائرہ میں نہ سما سکی اور جسکی حقیقت ان کے سامنے ابھی نمودار نہیں ہوئی۔ ایسے ہی ان لوگوں نے انکار کیا جو ان سے پہلے تھے تو دیکھو ظالموں کا انجام کیا ہوا)۔ اسی کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ آپ نے فرمایا لا تصدقوا اهل الكتاب اہل کتاب کی تصدیق نہ کرو (یعنی جو کچھ کتب مقدسہ سے روایت کریں اسکی تصدیق نہ کرو کیونکہ انھوں نے انکو محفوظ نہیں رکھا) ولا تكذبوهم اور نہ انکی تکذیب کرو (کیونکہ ممکن ہے وہ اُن باتوں میں سے ہو جسکی حقیقت ابھی ہمارے سامنے نہیں آئی ہے)۔

اگر تم کو شبہ ہو کہ کتب مقدسہ غیر محفوظ ہیں اس وجہ سے اگر قرآن کی تاویل میں ہم اُن سے

رجوع کرینگے تو غلطی میں پڑنے کا امکان ہے، تو یہ شبہ بالکل بجا ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں کہتے۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ پہلے قرآن کو خود قرآن اور لغت عرب کی مدد سے سمجھنا چاہیے پھر اگر کتب مقدسہ میں کوئی ایسی بات ملے جو معنی اور اسلوب کے اعتبار سے اس سے اقرب ہو یا اس سے واضح تعلق رکھتی ہو تو دونوں باتوں پر تدبر اور ان کے اسلوبوں کے تقابل سے قرآن مجید کی بلاغت واضح ہوگی، نیز مختلف معانی میں سے ہم جس مفہوم کو مرجح قرار دینگے اس تائید مزید سے اس پر اعتماد محکم ہوگا علاوہ بریں وحی قدیم کی بعض ایسی باتوں کا مفہوم واضح ہو جائیگا جس کا واضح ہونا بظاہر محال نظر آتا تھا۔ یہ چیز اہل کتاب کے ارباب نظر کے لیے قرآن کی صداقت کی اور ہمارے لیے انکی کتابوں کی صداقت کی ایک دلیل ہوگی جس سے باہمی محبت کی راہیں کھلینگی اور یہ چیز ان کی ہدایت کے لیے بھی راہ ہموار کرے گی۔ لیکن اسکے برعکس، تم دیکھتے ہو کہ بعض مسلمان انجیل کی آیتوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور جو لوگ حضرت مسیح علیہ الصلوۃ والتسلیم کا مذاق اڑائیں ان کی شکایت اللہ تعالی کے سوا اور کس سے کی جاسکتی ہے! مسلمانوں کو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ان کو صرف خوب صورت انداز سے مباحثہ کی اجازت دی گئی ہے اور مخالف فریق کو برا بھلا کہنے سے نہایت سختی کے ساتھ روکا گیا ہے۔ اس چیز کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوا کہ ہم سے ان کی دوری بڑھتی گئی اور یہ خلیج اختلاف وسیع تر ہوتی چلی گئی اور پھر لازمی نتیجہ کے طور پر قبول حق سے بھی وہ محروم رہے۔ حالانکہ اگر یہ سچ ہے کہ حق باطل پر غالب رہتا ہے اور روشنی تاریکی کو مٹا دیتی ہے تو ہمارے اور ان کے درمیان اس سے بڑھکر کوئی حجت نہیں ہوسکتی کہ ہم دونوں چیزوں کو ایک ساتھ برابر برابر رکھدیں کہ جسکے اندر عقل اور مذاق سلیم موجود ہے وہ ان میں سے بہتر کو منتخب کرلے۔ قرآن مجید نے ہدایت پانے والوں کی تعریف یہی کی ہے۔ اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ (جو لوگ بات سنتے ہیں اور پھر اس میں جو بہتر ہوتی ہے اسکی پیروی کرتے ہیں)۔

یہ وجوہ داعی ہوئے کہ عہد جدید اور عہد عتیق میں جو کچھ ہے میں اس کی بھی جستجو کروں میری نیت نیک ہے۔ اور میرا اعتماد اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اس سے التجا ہے کہ وہ خیر کی راہوں میں میری رہنمائی فرمائے۔

ایک مستقل مقدمہ میں میں اُن باتوں کا ذکر کرونگا جو نصاریٰ کی گمراہی کا باعث ہوئیں اور جن پر ان کے موجودہ دین کی تمام عمارت قائم[1] ہے۔ مثلاً ابن اور اب کے الفاظ، روٹی اور شراب کا حضرت عیسیٰ کا گوشت اور خون ہو جانا۔ یہ بات کہ وہ خدا وند کے داہنی جانب بیٹھے ہیں، فرشتوں کی فوج میں اُتریں گے اور قیامت کے دن عدالت کرینگے، یہ بات کہ وہ فارقلیط کو بھیجینگے جو ان کو تمام تفصیلات شریعت کی تعلیم دیگا، نیز یہ امر کہ ان کے زمانہ کے لوگ اُن تمام باتوں کو دیکھینگے جن سے انھوں نے ڈرایا ہے، ان تمام امور کی حقیقت الفاظ کے معانی کی تحقیق سے واضح ہو جائے گی جیسا کہ آگے مذکور ہوگا۔

مقدمہ (۵)

قرآن قطعی الدلالۃ ہے

قرآن مجید بالکل قطعی الدلالۃ ہے۔ مختلف معانی کا احتمال محض قلت علم و تدبر کا نتیجہ ہے۔ جن علماء نے اپنی تفسیروں میں بہت سے اقوال نقل کر دیے ہیں، ان کا منشا یہ ہے کہ آیت کی تاویل میں جو کچھ کہا گیا ہے اسکو ہمارے سامنے رکھدیں۔ اس میں سے قول راجح کا انتخاب انھوں نے ہماری تمیز پر چھوڑا ہے۔ پس یہ بات جائز نہیں ہے کہ ہم بغیر کسی ترجیح و انتخاب کے تمام رطب و یابس یاد کرلیں۔ اور پھر حیرانی و سرگشتگی کی وادیوں میں ٹھوکریں کھاتے پھریں۔ مثال کے طور پر امام رازی رحمہ اللہ کی تفسیر میں بقرہ کی آیت ۱۹۱ کے ماتحت لفظ فتنہ کے معنی دیکھو۔ انھوں نے اس کے

[1] اس عنوان پر مولانا نے الاکلیل فی شرح الانجیل کے نام سے مستقل رسالہ لکھدیا ہے۔ اس مقدمہ میں اسکی مزید شرح نہ فرما سکے۔ (مترجم)

پانچ معانی بتائے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب صحیح نہیں ہیں۔ پس میں نے اپنی کتاب میں صرف وہی اقوال نقل کیے ہیں جو میری تحقیق پر صحیح اترے ہیں۔ اور یہی ہمارے اسلاف کا طریقہ تھا۔ اقوال کی کثرت تو ایک طالب کو بالکل حیران و درماندہ کر دیتی ہے۔ بسا اوقات لوگ مجرد اقوال نقل کر دیتے ہیں، ان کے دلائل بیان نہیں کرتے۔ یہ ان اقوال کے کہنے والوں اور ان کے سننے والوں دونوں پر نہایت کھلا ہوا ظلم ہے۔ میں نے آیات کے معانی تفسیر کی کتابوں سے نہیں لیے ہیں بلکہ خود آیات پر ان کے سیاق و سباق اور انکی مماثل آیات کی روشنی میں غور کیا ہے۔ اس طرح جب چند آیتوں کے معنی روشن ہو گئے تب میں نے تفسیر رازی یا طبری اٹھائی۔ ان میں کبھی تو ایسا ہوا کہ کوئی قول سلف کا میرے موافق مل گیا، کبھی میں سلف کے قول کے بالکل قریب قریب پہنچ گیا اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ جو معنی میری سمجھ میں آئے تھے اُن سے مجھے رجوع کرنا پڑا۔ اور ایسا بھی بارہا ہوا کہ کوئی مشکل ایسی پیش آگئی کہ اس کے لیے مجھے عرصہ تک توقف کرنا پڑا۔ لیکن ہر حال میں اشکال و ابہام کو میں نے اپنے علم و فہم کی کوتاہی اور غلط رایوں کی عامیانہ تقلید ہی پر محمول کیا۔

اگر تم کو اس بات پر تعجب ہو کہ ایک بالکل کھلی ہوئی اور واضح چیز میں ابہام و اشکال کا کیا ذکر! تو اسکے معنی یہ ہیں کہ اس کثافت پر تمہاری نظر نہیں ہے جسکی تہوں پر تہیں ہمارے اوپر ازمادی گئی ہیں۔ کتنے کھلے ہوئے حقائق ہیں جن میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن جن طبیعتوں پر تاریکی چھائی ہوئی ہے وہ ان کے دیدار سے محروم ہیں۔ وجود باری میں، اسکی واحدانیت و یکتائی میں، روح کی جسم پر حکومت میں، روز جزا میں، ایک صاحب بصیرت کے لیے کہاں شک کی گنجائش ہے؟ لیکن دیکھتے ہو کہ ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو وجود باری اور توحید باری وغیرہ جیسے حقائق میں بھی شک کرتے ہیں، پھر دوسرے مسائل کا کیا ذکر! یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ جس طرح حواس کو بیماریاں لاحق ہوتی ہیں اسی طرح عقل کی بھی بیماریاں ہیں اور جب وہ بیماریاں اس کو لاحق ہو جاتی ہیں

تو واضح سے واضح حقیقت بھی اسکی سمجھ میں نہیں آتی۔ کیونکہ باتیں عقل وحواس کی تندرستی کے لحاظ سے کہی جاتی ہیں تو جو عقل مبتلائے امراض ہوگی وہ ان کو کیسے سمجھ سکتی ہے؟ سورج چمک رہا ہے، شکر میٹھی اور سفید ہے، ایک سلیم الحواس انسان ان باتوں میں ایک لمحہ کے لیے بھی شک نہیں کریگا لیکن کیا ایک اندھے، ایک احول اور ایک تپ زدہ کا بھی یہی حال ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ قبول رشد و ہدایت میں سب کا حال یکساں نہیں ہو سکتا۔ قرآن شریف کی نسبت فرمایا ہے۔ ھدی للمتقین۔ پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے۔ وَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا (جب تم قرآن سناتے ہو ہم تمہارے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک کثیف پردہ ڈال دیتے ہیں)۔

سقراط کا قول مشہور ہے کہ نفس کو تمام حقائق معلوم ہیں لیکن اس پر نسیان طاری ہے۔ روحی کا مقولہ ہے کہ اپنے نفس کی تاویل کرو، قرآن کی تاویل نہ کرو۔ خواجہ حافظ کا ارشاد ہے کہ سب سے بڑا حجاب تمہارا نفس ہے، اسکو دور کردو۔ ان باتوں کا کیا مطلب ہے؟ بہرحال ہمارا عقیدہ یہی ہے کہ قرآن نے ادائے مطلب کے لیے وہی اسلوب اختیار کیے ہیں جو سب سے زیادہ واضح، سب سے زیادہ اقرب اور سب سے زیادہ خوبصورت تھے۔ اور جہاں کہیں کسی اسلوب میں کوئی تصرف کیا ہے تو کسی اہم فائدہ کے لیے کیا ہے۔ ہم ایک علحدہ مقدمہ میں اس پر بحث کرینگے اور وہاں تاویل کے وہ اصول بیان کرینگے جو مختلف اقوال کے احتمال کا سدباب کر دینگے۔[۱] آیات متشابہات اور حروف مقطعات کے باب میں بھی ہمارا یہی مذہب ہے۔ وہ اپنی دلالت میں زیادہ سے زیادہ واضح ہیں۔ ہم ایک مستقل مقدمہ میں ان پر بھی گفتگو کرینگے۔

---

[۱] اصول تاویل پر مولانا مرحوم کا ایک مستقل رسالہ ہے۔ اب تک اسکی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ لیکن شاید جلد چھپ سکے۔ (مترجم)

مقدمہ (۶)

مناسبت و ترتیب

جس طرح ایک سپہ سالار اپنی افواج کو مختلف ڈھنگ سے ترتیب دیتا ہے، اور اسکی تدبیروں اور مصلحتوں کو صرف ماہرین فن ہی سمجھ سکتے ہیں، عوام صرف فتح و غلبہ سے اسکی مہارتِ فن کا اندازہ کر سکتے ہیں، اُسی طرح قرآن مجید میں ایک ہی بات مختلف طریقوں سے کہی جاتی ہے اور صرف ماہرین بلاغت ہی اسکے اسرار و نکات کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے بعض مفسرین کے نزدیک اس کا مقصد قرآن کے اعجاز کو ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک اعجاز قرآن کے اغراض و مقاصد میں سے نہیں ہے، اسکے لوازم میں سے ہے۔ اس کائنات کے اندر ایک چھوٹے سے وا نے بلکہ ایک حقیر سے ذرے سے لیکر اس گنبد گرداں تک جو کچھ ہے سب معجزہ ہی معجزہ ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی چیز کی خلقت بھی اظہار اعجاز کے لیے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے لیے ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دوسرے ان کو بنانے سے عاجز ہیں اس لیے ثابت ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہیں۔

قرآن میں ایک ہی چیز کبھی عمود کی حیثیت سے آتی ہے، کبھی ضمنی مضمون کی حیثیت سے۔ کبھی وہی چیز اجمال کے ساتھ آتی ہے، کبھی تفصیل کے ساتھ۔ کبھی ایک چیز موخر ہوتی ہے کبھی مقدم۔ کبھی تنہا ہوتی ہے کبھی اپنے مقابل کے ساتھ۔ کبھی کسی چیز کے ساتھ اسکا جوڑ ہوتا ہے کبھی کسی چیز کے ساتھ۔ بالکل یکساں مضمون مختلف سورتوں میں مختلف ترتیبوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب ایک ہی شے اپنے مختلف پہلوؤں سے تمہارے سامنے جلوہ گر ہوگی تو اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے اور پوری طرح پہچان لینے میں تمہیں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ اگر ایک ادا سے نگاہ چوک گئی، تو دوسرا جلوہ سامنے آجائیگا۔ قرآن مجید کی اسی صفت کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا

ہے۔ کذالک نصرف الآیات لعلھم یفقھون۔ "اسی طرح ہم ہیر پھیر کر اپنی آیتیں بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں"۔

اور ہر تالیف میں ایک خاص حکمت ملحوظ ہوتی ہے۔ ہم بالاجمال تالیف کے مختلف طریقوں کی طرف یہاں اشارہ کرنا چاہتے ہیں اور اوپر جن پانچ امور کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

سب سے پہلے عمود پر غور کرو۔ عمود ہر سورہ کا ایک ہوتا ہے لیکن یہی ایک بسا اوقات بہت سی چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ مثلاً سورہ حجرات کے عمود کو لو۔ ہے یہ ایک ہی بات۔ گو لغت میں ہم اس کے لیے ایک ہی جامع لفظ نہ پاسکیں۔ تعبیر مطلب کے لیے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس سورہ میں بدخلقی پر توبیخ ہے، عام اس سے کہ وہ بدخلقی خیال سے تعلق رکھتی ہو، یا قول سے، یا عمل سے۔ چنانچہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گفتگو میں سبقت، آپ کی آواز پر آواز بلند کرنے، عام آدمیوں کی طرح آپ کو پکارنے، بے ضرورت اور بے موقع آپ کو زحمت دینے اور کسی فاسق کی اطلاع پر کسی قوم پر ٹوٹ پڑنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ پھر مسلمانوں کی دو جماعتوں میں اصلاح، ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت، اور ان کے درمیان عدل کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد لوگوں کے ساتھ تمسخر سے، عیب جوئی سے، تنابز بالالقاب سے، بدگمانی سے، تجسس سے، غیبت سے، غرور نسب سے، ادعائے پارسائی سے اور پھر سب سے آخر میں، سب سے بدترین شے، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے اسلام کا احسان دھرنے سے روکا گیا ہے۔ یہ ایک مثال میں نے اس لیے پیش کی ہے کہ تم وحدت میں کثرت کا جلوہ دیکھ سکو۔ اس کے حسن نظام پر مفصل بحث اپنے مقام پر ملے گی۔

عمود کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سورہ کے اندر اپنی حقیقت کے اعتبار سے سب سے عظیم الشان بات ہو۔ اس کے لیے عظیم الشان بات نہیں بلکہ سب سے زیادہ جامع بات ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ وہ

سورہ کے تمام مطالب کے لیے شیرازہ ہے - ہاں بیان کے لحاظ سے وہ سورہ کے اندر سب سے زیادہ اہم چیز ہوگی - سورہ نور کے اندر، آیت نور کس طرح آفتاب تابان بنکر چمک رہی ہے، لیکن اسکے باوجود وہ سورہ کے اندر بالکل ضمنی چیز ہے - عمود کی حیثیت سے نہیں ہے - عمود اس کا عورتوں سے متعلق حسن ادب کی تعلیم ہے - اسی وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ یہ سورہ عورتوں کو پڑھائی جائے تاکہ وہ اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کو معلوم کر سکیں -

یہ تو کسی چیز کے بطور عمود آنے کی شکل تھی - ضمناً آنے کی صورت یہ ہے کہ کوئی چیز بطور دلیل یا مثال آ جائے - یا بعد میں آنیوالے دعوی کے لیے کسی مثال یا حجت سے تمہید استوار کی جائے یا ماسبق کی توضیح یا تحدید کی جائے - یا کوئی سوال پیدا ہوتا ہو اسکا جواب دیا جائے - یا اپنے مابعد کی تمہید ہو، یا کوئی مناسب مقام حکمت بر سبیل ذکر آ جائے، یا ماسبق کی تفصیل ہو، یا وعد و وعید اور مدح و ذم کے ذریعہ سے تحریض ہو، یا کسی مزید علم کا بیان ہو، یا موقع کی مناسبت سے حمد الٰہی اور صفات رب کا بیان ہو اور یہی چیز قرآن حکیم کی روح ہے -

اب ہم مختصراً اوپر کی باتوں میں سے پانچویں بات کی کسی قدر وضاحت کرنا چاہتے ہیں یعنی اس امر کی کہ کس طرح ایک شے کبھی ایک چیز کے ساتھ ملائی جاتی ہے اور کبھی دوسری شے کے ساتھ اگر تم اس بات کا یقین رکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نہایت اعلیٰ حکمت مدنظر رکھی ہے تو جب تم ایک شے کو کسی شے کے ساتھ دیکھو گے تو ضرور ان دونوں کے درمیان مناسبت تلاش کرو گے یہ تلاش ایسے مخفی دقائق حکمت تک تمہاری رہبری کریگی جن دقائق تک وہ شخص کبھی نہیں پہنچ سکتا جو تدبر کا عادی نہیں ہے - ایک ہی شے کے مختلف پہلو ہوتے ہیں، ایک پہلو سے وہ کسی چیز سے مناسبت رکھتی ہے اور دوسرے پہلو سے کسی چیز سے - مثلاً دیکھو نماز اور حج میں کتنی مناسبتیں موجود ہیں - دونوں ذکر الٰہی کی صورتیں ہیں، دونوں بدنی عبادتیں ہیں، دونوں بیت اللہ سے تعلق رکھتی ہیں، نیز نبی

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ طواف نماز ہے۔ نماز میں اتنی مناسبتیں حج کے ساتھ تھیں۔ اب روزہ کے ساتھ نماز کی مناسبتوں پر غور کرو۔ دونوں کسی مخصوص جگہ کی قید سے آزاد ہیں، دونوں کی بنیاد صبر پر ہے یہاں تک کہ پہلے ادیان میں سکوت بھی روزہ کے شرائط میں شامل تھا، اس اعتبار سے گویا نماز نفس کا باطنی روزہ ہے۔ پھر نماز کی مناسبت زکوٰۃ کے ساتھ دیکھو۔ یہ دونوں متقابل ہیں دونوں ایک دوسرے سے کمال کو پہنچتی ہیں۔ دونوں ایک ہی جڑ سے پھوٹی ہیں۔ نماز کی حقیقت بندہ کا خدا کی طرف محبت اور خشیت سے مائل ہونا ہے اور زکوٰۃ کی حقیقت بندہ کا بندہ کی طرف محبت اور شفقت سے مائل ہونا ہے۔ پس کمال سعادت کے لیے دونوں لازمی ہیں اور ان دونوں کی روح محبت ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ خود دین کی حقیقت بھی محبت، گداز باطنی اور لطافت احساس ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام صفات میں رحم کو مقدم کیا اور فرمایا کہ وسعت رحمتی کل شئی، میری رحمت ہر چیز کو حاوی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ دین کی اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا عکس اسکے بندوں میں نظر آئے اور اسی چیز کی وجہ سے انسان خدا کی خلافت کی عزت سے سرفراز ہوا۔ پس نماز کی مناسبتوں پر غور کرنے سے ہم کو دین کی اصل اور تمام شرائع کی روح کا سراغ لگ گیا۔ یہی حقیقت تورات و انجیل سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھو مقدمہ د ۱۰)

ایک اور ذرا دقیق مثال لو۔ سورہ عقود میں اللہ تعالیٰ نے پہلے کھانے کی چیزوں میں سے جو چیزیں جائز ہیں انکو بیان کیا، پھر جن عورتوں سے نکاح جائز ہے انکو بیان کیا، پھر وضو کا ذکر فرمایا اب ان کی مناسبت پر غور کرو گے تو دو چیزیں تمہارے سامنے آئینگی۔ ایک شئی اور ایک شرط شئی۔ شرائط میں سے وہ چیزیں بیان کیں جن سے یہ چیزیں پاک ہوتی ہیں۔ اب دیکھو ذبح چوپایوں کو پاک کرتا ہے، مہر اور احصان سے عورتیں پاک ہوتی ہیں اور وضو نماز کی پاکی ہے۔ پھر تمام حقیقت کو آخر میں یہ فرما کر کھول دیا ما یرید اللہ لیجعل علیکم من حرج ولکن یرید لیطھرکم ولیتم

نعمتہ علیکم۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی ڈالے بلکہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے۔ یہ شرائط کا بیان تھا۔ اب اشیاء پر غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ یہاں تین چیزیں بیان کی گئیں: طیباتِ طعام، طیباتِ نساء، طیبات نماز۔ اگر اس سے زیادہ تعمق کی نگاہ سے دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ یہ دنیا عالم کون وفساد ہے، پس یہاں تین عوالم ہیں: عالم شخص، عالم نوع اور عالم روح کے نقص کی تلافی تین چیزوں :۔ طعام۔ نکاح۔ اور نماز سے فرمائی پھر طعام اور نکاح میں ایک اور مناسبت بھی ہے کہ دونوں میں سے جو چیزیں حرمت کا محل ہیں ان کی تخصیص کردی گئی چنانچہ دیکھو دونوں آیتیں بالکل ایک ہی نہج پر وارد ہوئیں۔ حرمت علیکم امھاتکم وبناتکم الآیہ حرمت علیکم المیتۃ والدم الآیہ۔ اسی طرح نماز اور نکاح میں مناسبت کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ نکاح بدکاری کی آلودگیوں سے حفاظت کرتا ہے اور نماز فحشاء اور منکر سے روکتی ہے ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر۔ یہ مناسبت دونوں میں پاکیزگی کے پہلو سے تھی۔ بقرہ میں تخفیف کے پہلو سے ان کی مناسبت دیکھو۔ فرمایا حافظوا علی الصلوٰت ..... فان خفتم فرجالا او رکبانا۔ یہی صورت حال نکاح میں ہے۔ نکاح کی حفاظت حتی الامکان واجب ہے مگر طلاق کے وقت اس میں کسی قدر تخفیف کی گئی۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں ہر تالیف اپنے اندر ایک نیا جلوہ حسن وجمال رکھتی ہے۔

مقدمہ (۷)

ہر سورہ میں ایک مخصوص نظام ہے

اس مقدمہ میں ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہر سورہ میں ایک مخصوص نظام ہے اور اقتضاب، جو بظاہر نظر آتا ہے، محض قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔ یہ بات ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ قرآن کی سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی۔ پس اگر ہر سورہ میں کوئی ایک مقصد ومنہج نہ ہوتا، جیسے پورے ہونے سے سورہ

پوری ہوتی ہے، تو یہ الگ الگ حد بندیوں کی کیا ضرورت تھی؟ سارے قرآن کو ایک سورہ بنا دیا جاتا۔ نیز جب سورتوں کے لیے کوئی خاص مقدار نہیں ٹھیرائی گئی، بڑی چھوٹی ہر طرح کی سورتیں ہوئیں تو اگر ہر سورہ کے اندر کوئی نظمی وحدت مد نظر نہیں ہے تو آیتوں کو ایک لڑی میں پرونے کی کیا ضرورت تھی؟ اجزاء یوں ہی بکھیر دیے جاتے۔ اور اگر سطر سطر کے برابر کے اجزاء ہوتے جب بھی کوئی مضائقہ نہ ہوتا۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ آیات کا ایک مجموعہ ایک سورہ کے اندر رکھا گیا اور وہ سورہ کے نام سے موسوم ہوا۔ گویا ایک شہر بسا کر اسکے اردگرد شہر پناہ کھینچ دی گئی۔ تو اب غور کرنے کی بات ہے کہ ایک شہر پناہ کے اندر کئی شہر کیسے جمع ہو سکتے ہیں! یہ بھی واضح ہے کہ معانی کا تشابہ بھی انکو ایک شہر پناہ کے اندر نہیں جمع کرتا۔ معوذتین باہمد گر جسقدر مشابہت رکھتی ہیں، معلوم ہے تاہم دو مستقل سورتیں قرار پائیں۔ اسی طرح سورۂ تکویر، انشقاق، مرسلات، نازعات، ذاریات سب متحد المعنی سورتیں ہیں لیکن نظم اور اسلوب کلام ان میں مختلف ہیں۔

یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ جب قریش قرآن کے مانند دس سورتیں لانے سے عاجز رہے تو ایک سورہ کے لیے تحدّی ہوئی۔ اس سے کم کے لیے تحدی نہیں ہوئی۔ اور سورتیں چھوٹی بڑی ہر قسم کی مراد ہیں۔ لیکن اس سے ایک سورہ کے بقدر کلام مراد نہیں ہے۔ ہمارے بعض مفسرین کو یہی غلط فہمی ہوئی چنانچہ انکو کلام کی اتنی مقدار میں وجہ اعجاز تلاش کرنے میں زحمتیں پیش آئیں۔ مثلاً آیت حرمت علیکم امہاتکم و بناتکم سورہ کوثر سے مقدار میں زیادہ ہے لیکن اس سوال میں انکو حیرانی پیش آئی کہ اس میں وجہ اعجاز کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ تحدی میں مقصود ایک سورہ بحیثیت مجموعی ہے۔ بلاشبہ ایک سورہ کے مانند لانا تمام جن و بشر کی طاقت سے باہر ہے۔ اگرچہ سورہ کوثر کی سی مختصر ہی سورہ کیوں نہ ہو۔ اس سے غالب گمان یہ ہوتا ہے کہ سورہ سے اللہ تعالیٰ

کی مراد ایک منتظم کلام ہے۔ اس میں چھوٹی بڑی کا امتیاز نہیں ہے۔ جس طرح درخت، نبات، حیوان کے الفاظ ہیں جو اپنے ماتحت اپنے تمام چھوٹے بڑے اجزاء پر مشتمل ہیں اسی طرح سورہ کا لفظ طوال و قصار سب پر مشتمل ہے۔ بعض علماء کے اقوال سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ امام سیوطیؒ نے اتقان میں جعبری کا ایک قول نقل کیا ہے۔

"سورہ کی حد قرآن کی اتنی مقدار ہے جو چند آیات پر مشتمل ہو جن میں تمہید اور خاتمہ ہو اور اسکی کم سے کم مقدار تین آیت ہے۔"

اس محقق کے نزدیک سورہ کے لیے ایک ایسی نظمی وحدت ضروری ہے جس میں تمہید، خاتمہ اور عمود ہو اس لیے کم از کم تین آیتیں سورہ کی تالیف کے لیے ضروری ہوئیں۔

مزید برآں اگر تم چھوٹی سورتوں پر تدبر کرو تو معلوم ہوگا کہ ربط و نظام کے محاسن کے لحاظ سے وہ بڑی سورتوں کی ہمسر ہیں۔ کیونکہ چھوٹی آیتوں کے اندر بھی ربط و پیوستگی کی وہ تمام نزاکتیں موجود ہیں جو بڑی آیتوں کے اندر ہیں۔ اس لیے یہ خیال کرنا کہ چھوٹی سورتوں مثلاً ماعون، کوثر اور عصر وغیرہ میں بے نظمی ہے سخت غلطی ہے۔ ان سورتوں کا باریک ہنج اگر تمہاری سمجھ میں آجائے تو طوال کا ہنج سمجھنے میں اس سے تمہیں بڑی مدد ملیگی۔ اسی طرح طوال کے اندر آیتوں کے ایسے مجموعے ہیں جنکا نظم و ربط بالکل واضح ہے صرف ایک غبی آدمی ہی انکے سمجھنے سے قاصر رہ سکتا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ کی ابتدائی بیس آیتیں۔ پس جو شخص ان میں تفکر کرے اس میں آہستہ آہستہ اُن سے زیادہ دقیق نظام سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن کے تفکر میں میرا یہی حال ہوا۔ اور میں یقین رکھتا ہوں کہ جو لوگ جستجو کی یہ راہ اختیار کرینگے وہ بالآخر نظم کو پالینگے۔ والذین اھتدوا زادھم ھدیً۔

مقدمہ (۸)

احکام و حقائق کے باب میں قرآن اور کتب سابقہ کا تعلق

سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد تاروں کی روشنی کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اسی طرح

قرآن کے نزول کے بعد مسلمان اُن پچھلے صحیفوں سے بالکل بے نیاز ہو گئے جن میں جھوٹی اور سچی ہر قسم کی باتیں مل گئی تھیں۔ تاہم قرآن مجید آسمانی صحیفوں میں سے ایک ہے اور ہمارے نبی کریم محمد رسول اللہ صلعم جماعت انبیاء کے ایک فرد ہیں۔ اور تمام مسلمان انبیاء کی کثرت کے باوجود، ایک ہی امت ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے لیے پچھلے صحیفوں کی تعلیمات کو جاننا ضروری ہے۔ اس سے گوناگوں فوائد حاصل ہوں گے۔ اس سے قرآن عظیم کی قدر و عظمت معلوم ہوگی اور ہم اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت پر اسکے شکر کی توفیق پائینگے۔ اس سے قرآن مجید کی وہ تلمیحات واضح ہونگی جو ہمارے متاخرین مفسرین سے مخفی رہ گئیں اور وہ ایک سے زیادہ مقامات میں اصل حقیقت تک پہنچنے سے قاصر رہ گئے نیز اس سے اہل کتاب پر حجت کے دلائل ہاتھ آئینگے جو بجائے خود ایک بڑا فائدہ ہے۔

قرآن مجید، اگلے صحیفوں کے بعد، دو خاص مقصدوں سے نازل ہوا ہے۔

۱۔ دین کا جو حصہ باقی رہ گیا تھا اسکی تکمیل کے لیے۔

۲۔ جن چیزوں میں اہل کتاب مختلف ہو گئے تھے، یا جن میں بھٹک گئے تھے، یا جنکو بھلا دیا تھا، یا جن میں زیادتی یا تبدیلی کر دی تھی، انکی وضاحت کے لیے۔ جیسا کہ کہا ہے ویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمنا قلیلا (ان لوگوں کے لیے ہلاکی ہے جو کتاب اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے تاکہ اسکے ذریعہ سے کچھ معاوضہ حاصل کرلیں)

یہ اصلی مقاصد ہیں۔ باقی اس پر مزید ذکر الٰہی، دعوت اور موعظت کی وہ باتیں ہیں جو کتب مقدسہ کی خصوصیات میں سے ہیں۔

قرآن مجید نے اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے صرف معالی امور اور حقائق حکمت کو پیش نظر رکھا، اور قصص، ظواہر احکام، اور سفاسف تاریخ کی ان تفصیلات سے زیادہ تعرض

نہیں کیا جن سے بالعموم قرآن کے مخاطب واقف تھے - کیونکہ واقفیت کے باوجود انکو دہرانا طبائع پر بار اور بالکل بے نتیجہ ہوتا - چنانچہ قرآن نے جو قصے بیان کیے ہیں نہایت بلاغت کے ساتھ یا تو بطور تلمیح اور مثال بیان کیے ہیں یا اہل کتاب کی کسی بڑی تدلیس کو واضح کرنے کے لیے بیان کیے ہیں - اسی طرح معلوم احکام میں صرف اس حصہ سے تعرض کیا ہے جو تہذیب و تکمیل کا محتاج تھا آنحضرت صلعم پر ایمان لانے والے یا تو اہل کتاب میں سے تھے یا ان لوگوں میں سے جو اہل کتاب کے سے ملے جلے ہوئے تھے اس وجہ سے کتب سابقہ کی باتوں سے واقف تھے اور قرآن مجید کے اس ایجاز سے انکو اصل مسائل کے سمجھنے میں کوئی اشکال نہیں پیش آتا تھا - بلکہ سابق صحیفوں اور قرآن مجید میں اصولی تعلیمات کے اتفاق کے باوجود جو فرق عظیم وہ پاتے اس سے انکی نظروں میں قرآن کی عظمت بہت بڑھ جاتی - ان لوگوں کے تاثر کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے - واذا سمعوا ما انزل الی الرسول تری اعینھم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق یقولون ربنا امنا فاکتبنا مع الشاھدین (جب وہ سنتے ہیں اس چیز کو جو رسول پر اتری ہے تو انکی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں بسبب اس حق کے جس کو انھوں نے پہچان لیا - کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لائے - پس ہمکو گواہی دینے والوں میں لکھ)

اس تفصیل سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں -

۱ - پرانے صحیفوں کی تصحیح و تاویل قرآن کی روشنی میں کرنی چاہیے - اہل کتاب کے لیے حق معلوم کرنے کی راہ یہی ہے -

۲ - قرآن اور کتب سابقہ کے مشترک قصص میں جہاں اختلاف ہوگا وہاں ہم قرآن کی طرف رجوع کرینگے، کیونکہ قرآن محفوظ ہے -

۳ - ابتداء سے لیکر اتمام شریعت تک کے تمام مدارج کا جو شخص مطالعہ کریگا اس پر اس ملت

کاملہ کی فضیلت واضح ہوگی۔

۴۔متضاد اور مخلوط اسرائیلیات کی حقیقت واضح ہوگی، اور ہم میں سے جو لوگ ان کے سبب سے غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں انکی غلطیوں کی اصلاح ہوجائے گی۔

۵۔اہل کتاب پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ قرآن انکی کتابوں سے اخذ نہیں کرتا بلکہ ان کی غلطیوں کی اصلاح کرتا اور ان کو اوہام کی وادی سے نکال کر حقیقت کی شاہراہ پر لاتا ہے۔

۶۔قرآن کی ان بہت سی آیتوں کی صحیح تاویل ہوسکیگی جو درحقیقت توریت کی طرف اشارہ کررہی ہیں لیکن ہمارے مفسرین انکو قرآن سے متعلق خیال کرتے ہیں۔مثلاً ما ننسخ من آیۃ او ننسھا الآیہ۔ یا فینسخ اللہ ما یلقی الشیطن الآیۃ۔اس مقدمہ کو تمام کرنے سے پہلے ایک بات کا ذکر ہم ضروری سمجھتے ہیں جو عیسائی عام مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے پیش کرتے ہیں اور اس کو ہمارے خلاف اپنی سب سے زیادہ مضبوط دلیل سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ از روئے قرآن انجیل پر ایمان لانا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ لہذا اگر قرآن کسی امر میں انجیل کی مخالفت کرے تو وہ خود اپنے آپ کو جھٹلائیگا۔اسکے بعد وہ ہمکو ان تمام مغویات و مزخرفات پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں جو انھوں نے اپنی کتاب میں ملادی ہیں اور اپنے دعوے پر قرآن مجید کی بعض آیتوں سے دلیل لاتے ہیں مثلاً .... ؎۱

مقدمہ (۹)

سورتوں کی مقدار

اوپر لکھ چکا ہوں کہ قرآن مجید کی چھوٹی سورتیں اپنی عظمت، اپنی حکمت اور اپنے نظم کے اعتبار سے بڑی سورتوں کی ہمسری کرتی ہیں۔اب اس اجمال کی تفصیل کرتا ہوں۔

؎۱ اس مقام پر اصل میں بیاض ہے۔ (مترجم)

ہمارے قدیم علماء نے بھی بعض چھوٹی سورتوں کی نسبت کہا ہے کہ یہ تہائی قرآن کے برابر ہیں یا بعض کی نسبت کہا ہے کہ یہ پوری کرنے والی ہیں۔ مثلاً سفیان بن عینیہ سے روایت ہے کہ سورہ فاتحہ نماز کو پوری کرنے والی ہے کیونکہ یہ علم کو پورا کرنے والی ہے۔ حضرت امام شافعیؒ سے روایت ہے کہ اگر صرف سورۂ عصر نازل ہوتی تو بھی کافی تھی۔ جو لوگ اہل تدبر ہیں وہ کم از کم خاص سورتوں کے بارہ میں تو اس حقیقت کے اعتراف سے انکار نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر وہ مزید تدبر کرینگے تو ان کو اس امر میں بھی شبہ نہیں باقی رہیگا کہ جو سورتیں اپنے قامت کے اعتبار سے جتنی ہی چھوٹی ہیں معنی کے اعتبار سے اتنی ہی بڑی ہیں۔ چھوٹے سے حجم کے اندر اسرار حکمت کے اتنے خزائن بند ہیں کہ اگر کھول دیے جائیں تو دفاتر کے اندر نہ سمائیں۔

اس کی حکمت اور اسکی نوعیت مثالوں سے واضح کرنا چاہتا ہوں:۔

(۱) اسکی پہلی حکمت یہ ہے کہ دین کے اصول شدتِ ضرورت کے لحاظ سے اس امر کے مقتضی ہیں کہ ہمیشہ مستحضر رہیں۔ یہ چیز چاہتی ہے کہ ان کو نہایت مختصر کلمات اور جچے تلے الفاظ کے اندر گرہ کیا جائے کہ امثال کی طرح زبانوں پر چڑھ جائیں اور ادا کرنے کے لیے نہایت ہلکے پھلکے لیکن دل کے لیے نہایت گراں ارز اور وزنی ہوں۔ اس طرح کی باتوں کو اگر طویل عبارتوں میں بیان کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ اُن کے پھیلاؤ کے اندر گم ہو جائیں۔

(۲) دوسری حکمت یہ ہے کہ تعلیم کی ابتدا میں قلوب بند ہوتے ہیں۔ نہ تفصیلات کلام کے لیے انکے اندر گنجائش ہوتی ہے نہ جزئیات احکام کے لیے۔ اس وجہ سے صرف جوامع الکلم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ صالح بیج جب پھوٹتا ہے تو تفصیلات سے اس کی آبیاری کی جاتی ہے اور اس طرح آہستہ آہستہ دل کی وسعت اور اسکے علم دونوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۳) اہلِ عرب سجع کی طرح ایجاز کے بھی بڑے دلدادہ تھے اس وجہ سے پہلے اسی اسلوب

کلام میں انکو دعوت دی گئی جسکے لیے وہ مستعد تھے تاکہ انکو اپیل کرے۔

(۴) ان کے کاہنوں کا کلام ایجاز اور سجع دو چیزوں کا مجموعہ ہوتا تھا۔ اسکے وہ گرویدہ تھے اور اس کو غیبی کلام کی ایک ضروری خصوصیت خیال کرتے تھے۔ یہ مناسبت مقتضی ہوئی کہ قرآن مجید بھی یہی روش اختیار کرے تاکہ وہ اس سے بیگانگی نہ محسوس کریں۔

باقی رہا چھوٹی سورتوں کا بڑا ہونا تاویل کے پہلو سے تو.........[1]

مقدمہ (۱۰)

قرآنی تعلیم کے اصولی مسائل

تعلیم قرآنی کے بنیادی مسائل دو حصوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ عقائد، اور اعمال۔ اعمال تین قسم کے ہیں شخصی، منزلی، مدنی۔ عقائد کے اساسی مسائل توحید، نبوت، معاد ہیں (اپنے دلائل کے ساتھ)۔ اعمال میں نماز ہے اور اسی میں حج شامل ہے۔ زکوۃ ہے اور اسی کا جزء روزہ ہے۔ مکارم اخلاق ہیں یعنی بر و معروف جس کا ضد منکر ہے اور شہادت بالحق ہے یہ شخصی اعمال ہیں لیکن ان کا تعلق جماعت سے بھی ہے۔ اسکے بعد قسط اور اسکے بعد تعاون کا درجہ ہے۔

توحید کے ساتھ جبر و قدر اور وحدت الوجود کا تعلق ہے۔ پھر اسکے اور نبوت کے ساتھ شفاعت کا تعلق ہے۔ معاد کے ساتھ جنت و دوزخ کی حقیقت کے مسائل ہیں۔ قسط میں میراث، نکاح اور معاملات داخل ہیں۔ تعاون میں خلافت، سیاست اور جہاد شامل ہیں۔ پھر اعمال کے سرچشمے اخلاق میں بھی ہیں، مثلاً محبت، صبر، عزم، تقوی اور عدل ہیں۔ ان میں سے بعض چیزیں

[1] یہاں مولف رحمہ اللہ علیہ نے بیاض چھوڑ دی ہے اور ایک نہایت اہم بحث ناتمام رہ گئی ہے لیکن فراہی کی جو تفسیریں شایع ہو چکی ہیں ان میں سے تفسیر سورہ کوثر جسکا ترجمہ ان صفحات میں بھی شایع ہو چکا ہے، اس ناتمام بحث کو مکمل کر دیتی ہے۔ (مترجم)

باعتبار اصول باہم گتھی ہوئی ہیں۔ میں نے کتاب اللہ سے جو کچھ سمجھا ہے اُسکی روشنی میں بقدر ضرورت بعض مسائل پر گفتگو کرونگا۔

جہاد - قدماء کا خیال یہ تھا کہ آیت سیف نے موعظت کی بہت سی آیتوں کو منسوخ کر دیا۔ ہمارے زمانہ کے متکلمین کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ آیت سیف نے منسوخ تو نہیں کیا ہے لیکن اسلام میں جہاد صرف دفاع کے لیے ہے۔ عہد نبوت میں جو غزوات ہوئے ان سب کی نوعیت یہی ہے۔ بعد میں خلفاء اور صحابہؓ نے جو لڑائیاں لڑیں وہ تمام ملوکانہ جنگیں تھیں۔ ان کو جہاد فی سبیل اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔

میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو اس وعدہ کی تکمیل کے لیے بھیجا تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا تھا اور آپکو اس ذمہ داری کا وارث بنایا تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اس حکم کے موجب تھی وطہر بیتی للطائفین والعاکفین والرکع السجود (اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو)۔ نیز آپ نبی خاتم کی حیثیت سے مبعوث ہوئے تھے اور آپکے دین کو اللہ تعالیٰ تمام ادیان پر غالب کرنے والا تھا۔ اسکے لیے آپکو حکم ہوا کہ لوگوں کو وعظ و تلقین فرمائیں کہ لوگ آپکی باتوں کو سنیں اور مانیں اور اس وقت تک آپکو قتال کی اجازت نہیں دی گئی جب تک حجت تمام نہ ہو جائے اور تبلیغ اپنی حد کو نہ پہنچ جائے۔ اس وقت آپکو کعبہ کو مشرکین کے ہاتھوں سے چھڑانے اور عہد ابراہیمی کے موجب دین حنیفی کے احیاء کا حکم ہوا اور ہجرت کے بعد آپکو قتال کی اجازت دی گئی۔ "ہجرت کے بعد" اس لیے کہ ہجرت سے پہلے جہاد، سوائے اسکے جو حفاظت نفس کے لیے ہو، سرتاسر ظلم و فساد ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قتال، دفاع کے لیے نہیں واجب ہوا بلکہ کعبہ کو فتح کرنے اور بنی اسمٰعیل کے اندر دین حنیفی کے احیاء کے لیے ہوا۔

باقی رہے غیر بنی اسمٰعیل تو ان کے اندر اس لیے کہ انکو عدل و قسط پر قایم کیا جائے اور زمین کو فساد سے پاک کیا جائے۔ اہل کتاب اور غیر بنی اسمٰعیل پر دین کے معاملہ میں کوئی اکراہ نہیں ہے ان کے لیے عدم ایمان کی صورت میں جزیہ کی راہ کھلی ہوئی ہے لیکن بنی اسمٰعیل کے لیے یہ راہ باز نہیں ہے۔ ان کے اوپر ان ہی کے اندر کے ایک شخص کے ذریعہ سے حجت تمام کر دی گئی ہے سو وہ ان کا دل اور انکی زبان تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی باہر کے آدمی نہ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے وعظ کہنے کے لیے بھیجدیا ہو۔ آپ ان کے نخل فطرت کے ایک پختہ پھل تھے۔ ان کے اندر آپ پیدا ہوئے، ان ہی کی برائیوں اور بھلائیوں کے اندر آپکی نشو و نما ہوئی لیکن آپکی فطرت کی پاکیزگی نے انکی تمام خوبیاں اپنے اندر جذب کرلیں اور ساری برائیاں پھینکدیں یہاں تک کہ آپ اس شفاف روغن کے مانند ہو گئے جو آگ کے چھوئے بغیر بھڑک جانے کے لیے آمادہ ہو۔ آپ انکے تمام قویٰ کے مرکز، انکے تمام ترک و اختیار کے لیے قوت تمیز اور ان کے ارادے کے قلب تھے۔ آپکو ہدایت دے کر گویا اللہ تعالیٰ نے آپکی ذات کے اندر آپکی امت کو اپنے آگے سر فگندہ کردیا۔ کیونکہ آپ قلب تھے۔ جب قلب نے اطاعت کرلی تو گویا تمام اعضاء نے سر جھکا دیا۔ اسکی پوری تفصیل بحث نبوت میں ملیگی۔

پھر ظاہر اعتبار سے بھی صورت معاملہ اسی کی مقتضی تھی۔ عرب کی سرداری قریش کو حاصل تھی اور دینی پیشوائی کا منصب عبدالمطلب کو حاصل تھا اور عبدالمطلب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منتقل ہوا۔ اسی وجہ سے آپ نے فرمایا۔

انا ابن عبد المطلب　　انا النبی لاکذب

نیز آپ ملتِ ابراہیمی اور عہد قدیم کے داعی تھے تو جو اس کا مخالف ہوا وہ باغی اور مفسد ہوا۔

لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ رفع فساد کے لیے جو لوگ آمادہ جہاد ہوں ان کے لیے سب سے مقدم خود اپنے آپکو شائبۂ فساد سے پاک کرنا ہے ۔ جب تک امام اور اسکے متبعین خود قسط پر قایم نہ ہوں اس وقت تک ان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ قیام عدل وقسط کا علم لیکر اٹھیں پھر اپنے ملک کے اندر بغیر ہجرت کے جہاد جائز نہیں ہے ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگذشت اور تمام آیات ہجرت سے اس کا ثبوت ملتا ہے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ جہاد اگر صاحب جمعیت واطاعت بادشاہ کی طرف سے نہ ہو تو وہ بغی وعدوان اور فتنہ وفساد ہے ۔ پھر قتال کی اجازت حصول قوت کے بعد دی گئی ہے ۔ حضرت شعیبؑ کی سرگذشت میں اسکی دلیل موجود ہے ۔ انھوں نے فرمایا ۔

وان کان طائفۃ منکم آمنوا	اگر ایک جماعت تم میں سے اس چیز پر ایمان لائی ہے جسکو دیکر میں بھیجا
بالذی ارسلت بہ وطائفۃ لم یومنوا	گیا ہوں اور دوسری جماعت ایمان نہیں لائی ہے تو صبر کرو یہاں
فاصبروا حتی یحکم اللہ بیننا ۔	تک کہ اللہ تعالی ہمارے درمیان فیصلہ کردے ۔

ان تین شرطوں کے ساتھ جہاد قیامت تک کے لیے واجب ہے ۔ دین کے معاملہ میں اکراہ اور فساد وبغی جائز نہیں ہے لیکن حق کی شہادت ، تبلیغ اور مجادلہ حسنہ ضروری ہے ۔

مقدمہ (۱۱)

معروف ومنکر

معروف وہ ہے جسکو عرب نے معروف مانا ہو اور منکر وہ ہے جس کو انہوں نے منکر قرار دیا ہو ۔ اہل عرب جاہلیت میں ایسے جنگلی نہیں تھے جنکو خیر وشر میں کوئی امتیاز نہ ہو ۔ یونانیوں اور ہندوستانیوں کے روشن ترین دور میں ان قوموں کے ادب کا جو حال تھا ، اہل عرب کا ادب اخلاقی اعتبار سے ان سے بدرجہا اونچا تھا ۔ جن لوگوں نے انکی تاریخ مسخ کی ہے اگر ان کی مہملات

سے قطع نظر کرکے انکے کلام پر نظر ڈالو تو ان کا اخلاقی معیار معلوم ہوگا۔ یہاں تک کہ اس اعتبار سے انکا وہ شاعر بھی تمہاری نظروں میں وقیع معلوم ہوگا جو اپنی شہوت پرستیوں کے لیے مشہور ہوا اور ملک الضلیل کے لقب سے پکارا گیا۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہاں ایک ضمیمہ[1] میں ان کے کلام سے کچھ شواہد پیش کریں۔ تاکہ واضح ہو سکے کہ ان کے ہاں وہی چیزیں معروف تھیں جو مکارم اخلاق میں داخل ہیں اور قرآن نے ان کے سامنے جو چیزیں پیش کیں وہ انکے معروف کی تکمیل کرنے والی تھیں، اسکو ہدم کرنے والی نہیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اندر جو صالح طبیعتیں تھیں انکو قرآن نے اپنی طرف جذب کر لیا۔ صرف ان لوگوں نے مخالفت کی جو شر پر تھے یا جنکو اپنی پیشوائی کے چھن جانے کا اندیشہ تھا، ٹھیک اُس طرح جس طرح احبار یہود نے بغی وحسد کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی۔ امیہ بن ابی صلت وغیرہ کے متعلق کون نہیں جانتا کہ یہ دین حنیفی کے معتقد تھے لیکن محض بربنائے حسد ان لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔

پھر یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ نبی کی روح بیدار خود بھی معروف ومنکر کی معرفت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ جن چیزوں کے بارہ میں وحی کی رہنمائی موجود نہیں ہوتی ہے ان کے بارہ میں وہ اپنے الہام سے امت کو نزول وحی تک کے لیے حکم دیتا ہے۔ اور یہ کام اسکے منصب کا ایک قدرتی جزو ہوتا ہے۔ نیز اسکو خدا کی طرف سے امر بالمعروف کا حکم ہوتا ہے اور امت کو حکم ہے کہ وہ معروف میں سے جن باتوں کا حکم دے ان میں اسکی پیروی کرے۔ ان کے علاوہ آپکے زمانہ میں آسمانی شریعتوں کی بہت سی بچی کچی باتیں باقی تھیں۔ مثلاً دین حنیفی کی تعلیمات میں سے حج، قربانی، نماز کے کچھ بقایا موجود تھے، نیز اہل کتاب کے سنن موجود تھے (سرسید احمد کا یہ خیال غلط ہے کہ عربوں نے تمام مذہبی باتیں یہود سے اخذ کیں اور اسلام نے بھی اکثر احکام یہود ہی سے لیے اور

[1] یہ ضمیمہ مولانا یہاں نہ درج کر سکے لیکن اپنی دوسری تالیفات میں انھوں نے اس سے تعرض کیا ہے (مترجم)

دینِ حنیف کے آثار میں سے صرف توحید، ڈاڑھی اور ختنہ باقی رہ گئے تھے۔)

یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع میں جزئیات احکام کا حکم نہیں ہوا بلکہ معروف کا حکم ہوا مثلاً، نماز، ذکر، صدقہ، یتیم پر شفقت اور دوسرے مکارم اخلاق۔ پھر جب کسی چیز کے بارہ میں تفصیل نازل ہوگئی تو اس باب میں اسکی تعلیم اصل بن گئی اور معروف کا لحاظ ختم ہوگیا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی بارہ میں معروف کا حکم ہوا۔ پھر اس کے متعلق توضیح نازل ہوئی تو جس حصہ سے متعلق توضیح نازل ہوئی اس میں معروف منسوخ ہوگیا اور جس بارہ میں توضیح نازل نہیں ہوئی اس میں معروف کا حکم باقی رہا۔ مثلاً مرنیوالے کی وصیت والدین کے لیے منسوخ ہوگئی اور جن اقربار کو وراثت میں کوئی حق نہیں ملا ہے ان کے لیے باقی رہ گئی۔

اصل یہ ہے کہ جن جزئیات تک انسان کی عام عقل اور فطری صلاحیت خود بخود پہنچ سکتی تھی انکو اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر نہیں لادا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو تقویٰ اور نیکی کی جو صلاحیت خود ہمارے اندر موجود ہے وہ مردہ ہوجاتی۔ چنانچہ اس طرح کے معاملات میں اس نے ہماری عقل پر معروف کو چھوڑ دیا جیسا کہ بہت سی آیتوں میں دیکھتے ہو۔ .... اور یہ معروف کو باقی رکھ کر اور لوگوں کو اسکی دعوت دے کر پیغمبر نے ملک کے قانون اور اسکے اچھے رسوم کی عزت بڑھائی۔ اور انقلاب اور تخریب کی بجائے اصلاح اور تکمیل کی راہ اختیار کی۔ اور سابقہ ادیان کی بالاجمال تصدیق کی اور ان میں جو زیادتیاں شامل ہوگئی تھیں انکو خارج کرکے لوگوں کو انکی قدیم شاہراہ اور اس فطری ہدایت پر پہنچا دیا جو آدمؑ کے وقت سے موجود تھی۔

مقدمہ (۱۲)

نظم کی دلالت

نظم میں ایک خاص دلالت ہوتی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ سے جو

جہاد کیا اسکی دلیل انکو نظم ہی کے اندر سے ملی۔ انکے استدلال کی ترتیب گویا یوں تھی کہ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے وہ ہم سے الگ ہو گئے اور ان سے ہم کو قتال کا حکم ہے۔ تو جو لوگ زکوٰۃ نہیں دیتے ان کے لیے بھی یہی حکم ہونا چاہیے کیونکہ نماز کا ذکر ہمیشہ زکوٰۃ کے ساتھ ہوا ہے۔ جب کتاب اللہ میں اس کی جگہ نماز کے بعد ہے تو لازماً یہی جگہ اسکی دین کے اندر ہونی چاہیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر ہم نظم سے بے پروائی برتیں تو کتاب اللہ کے ایک بڑے حصہ سے محروم ہوجانے کا اندیشہ ہے۔

اس ذیل میں یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ربوٰ کی حقیقت قرآن میں زکوٰۃ کی حقیقت کے خلاف قرار دی گئی ہے اور سود خواروں سے جنگ کی اجازت دی گئی ہے تو لازماً یہی حکم مانعین زکوٰۃ کا ہوگا۔

مقدمہ (۱۳)

اجزائے نظام

تم اس بات سے ناواقف نہ ہوگے کہ قرآن مجید کی تقسیم رکوع اور تیس پاروں میں بعد کی چیز ہے اور اگر غور کروگے تو معلوم ہوگا کہ رکوع کا مقصد فصل ہے۔ جن لوگوں نے رکوع ٹھیرائے ہیں انھوں نے مفاصل کلام کا لحاظ کرکے انکی جگہیں متعین کی ہیں۔ انکے سامنے یہ چیز تھی کہ قاری ایسی جگہ قطع کلام نہ کردے جہاں وصل ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لحاظ سے ان کے اندازے کسی قدر صحیح ہیں۔ لیکن ترتیب کے علم کی ضرورت ہنوز باقی ہے۔ کیونکہ رکوع کی تقسیم صرف فصل کا پتہ دیتی ہے۔ حالانکہ فصل کے ساتھ وصل بھی ہے۔ رکوع کے ساتھ کلام بالکلیہ منقطع نہیں ہوجاتا اور ہر رکوع سورہ کے تمام اجزاء کو ایک درجہ پر کردیتا ہے۔ بسا اوقات ایک بات دوسری بات کے تحت میں ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کتابوں کو حصوں، پھر ابواب، پھر فصلوں، پھر فقرات

میں تقسیم کرتے ہیں - رکوع سے صرف فصل ظاہر ہوتا ہے - پس رکوعی تقسیم نے مفید ہونے کے باوجود نظم کے بیان کی ضرورت اور زیادہ بڑھادی - تعیین رکوع سے پہلے کلام بالکل متصل نظر آتا تھا جس کی وجہ سے وہ لوگ جو غور کے عادی تھے وجوہ اتصال کا بھی پتہ لگا لیتے تھے لیکن رکوع ٹھیرا دینے کے بعد قاری کو یہ گمان ہوتا ہے کہ یہاں بات بالکل ختم ہوگئی - اس لیے ایسی تقسیم کی ضرورت ہے جو ربط و انقطاع دونوں کو ظاہر کرے -

تیس پاروں کی تقسیم بالکل مقداری تقسیم ہے - اور بعض اوقات اس سے بھی قطع کلام کا گمان ہوتا ہے - میں اس کے ترک کو پسند کرتا ہوں - منازل کی تقسیم کافی ہے - یہ تقسیم سورتوں کے اجزاء کی قطع و برید بھی نہیں کرتی -

اوپر میں نے یہ جو کہا ہے کہ جن لوگوں نے سورتوں کو رکوع میں تقسیم کیا ہے ان کے اندازے کسی قدر صحیح ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر جگہ صحیح نہیں ہیں - انھوں نے بہت سے مفاصل چھوڑ دیے ہیں - مثلاً سورۃ قمر کو بلالحاظ اسلوب کلام و مقدار تین رکوع میں تقسیم کر دیا ہے حالانکہ اس کو چھ میں تقسیم کرنا تھا -

۱- اقتربت الساعۃ ۲- کذبت قبلہم قوم نوح ۳- کذبت عاد فکیف کان عذابی ونذر ۴- کذبت ثمود بالنذر ۵- کذبت قوم لوط بالنذر ۶- ولقد جاء آل فرعون النذر -

اس کام میں مدد خود قرآن مجید کے لفظی و معنوی اشارات سے مل سکتی ہے - لفظی اشارات کے لیے دلیل راہ سورتوں کے اوائل کے اسالیب ہیں مثلاً یاایھا الذین یاایھا الناس - الم تر - ارأیت - قل وغیرہ اور واضعین رکوع نے اسی سے مدد لی بھی ہے - اسی طرح قافیہ کی تبدیلی آیات کی مقدار، اسلوب کی یکسانی، عبارت کی ہم رنگی بھی

ان کے سامنے رہی ہے۔ ۔ [ا]

مقدمہ (۱۴)

سورتوں کے نام اور عمود سورہ

سورتوں کے نام میں چار اصول پیش نظر معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ بعض سورتوں کے نام ان کے ابتدائی الفاظ سے رکھ دیے گئے ہیں۔ سیوطیؒ کی تفصیل کے مطابق ایسی سورتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

الحمد، براۃ، سبحٰن، طٰہٰ، حوامیم، بینین، اقتربت، الرحمٰن، تبارک، سأل، عم، والنازعات، ارأیت، سورہ تبت وغیرہ۔ یہود کے ہاں بھی اسی اصول پر صحیفوں کے نام تھے۔

۲۔ بعض سورتوں کے نام ان کے کسی مخصوص لفظ سے ہیں۔ مثلاً زخرف، شعراء، حدید، ماعون وغیرہ۔ یہ الفاظ سورہ کے مقصد کو نہیں ظاہر کرتے بلکہ سورہ کے اندر بطور ایک نمایاں نشان اور علامت کے ہیں جو اپنے مسمی کو ممتاز کرتے ہیں۔ اہل عرب اس اصول پر اشخاص اور اشیاء کے نام رکھتے تھے۔ متلمس اور تابط شرا، وغیرہ ناموں میں یہی اصول ہے۔ اسی طرح منطقی معانی کو کسی عرض خاص سے ممیز کرتے ہیں اسکو حقیقت معنی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

۳۔ بعض سورتوں کے نام ایسے الفاظ سے ہیں جو سورت کے کسی اہم مضمون کا پتہ دیتے ہیں مثلاً سورہ نور کا نام آیت نور کی وجہ سے ہوا۔ آلِ عمران، سورہ نساء، سورہ ابراہیم سورہ یونس وغیرہ بہت سے اسماء اسی طریق پر ہیں۔

۴۔ بعض سورتوں کے نام ان کے اُس مقصد کے لحاظ سے ہیں جو سورہ میں روح کی طرح ساری ہے، مثلاً سورہ فاتحہ کا نام سورہ صلوٰۃ ہے، اسی طرح سورہ برائت اور سورہ بنی اسرائیل اور سورہ محمد سورہ قتال کے نام سے موسوم ہوئی۔ سورہ اخلاص اور معوذتین بھی اسی ذیل میں شامل

[ا] یہاں اصل میں بیاض ہے (مترجم)

ہیں۔ یہ چوتھا اصول تسمیہ میں سورہ کے اصل مقصد و مفہوم کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اگر ہر سورہ کا نام اسی اصول پر ہوتا تو اہلِ نظر کے لیے ہر سورہ کا نظام واضح ہو جاتا۔ میں اس میں کوئی قباحت نہیں دیکھتا کہ سورتوں کے ایسے نام بھی رکھے جائیں جو ان کے مقصد کا پتہ دیں بشرطیکہ شریعت اس سے مانع نہ ہو۔ اب میں اسی مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں .... با[1]

مقدمہ (۱۵)

تعیین خطاب

مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ پورا قرآن اللہ کا کلام ہے یعنی اس کو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام خطاب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ مثلاً ایاك نعبد وایاك نستعین میں ظاہر ہے کہ خطاب بندہ کی طرف سے ہے علماء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ تعلیم فرمائی ہے گویا یوں فرمایا کہ اس طرح کہو۔ لیکن یہاں کہو کا لفظ موجود نہیں ہے تو اس مقدر کو کیسے جانا جائے؟ اسی طرح کا سوال مخاطب کے باب میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ یعنی خطاب کن سے ہے۔ خطاب میں دو جہتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کس کی طرف سے دوسرا یہ کہ کس کی طرف۔ اور ان دونوں کا حال یہ ہے کہ کبھی عام ہوتے ہیں اور مراد خاص ہوتی ہے، اسی طرح اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ اور چونکہ جہت اختلاف کی تبدیلی میں اور اس کے عموم و خصوص کی وجہ سے معانی میں بڑی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ اسکے لیے ایسے اصول دریافت کیے جائیں جو مشکلات میں رہنمائی کریں۔ کیونکہ اس معاملہ میں بعض مرتبہ ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں جو آدمی کو شائبہ شرک کے قریب پہنچا دیتی ہیں۔ مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ ایک جگہ یہ تک کہہ گذرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو

[1] یہاں اصل میں بیاض ہے (مترجم)

نبی کا بندہ بنا دیا ہے کیونکہ آنحضرت صلعم کو حکم دیا ہے کہ آپ لوگوں کو یا عبادی الذین اسرفوا الآیہ (اے میرے بندو جنہوں نے زیادتی کی) کے الفاظ سے خطاب کریں - مولانا روم ؒ کے متعلق میرا یہ گمان نہیں ہے کہ انھوں نے فی الحقیقت نبی کو خدا کا شریک بنانا چاہا ہے - لیکن بات انکی زبان سے وہی نکل گئی ہے جو مشرکین کے اقوال سے مشابہت رکھتی ہے - اللہ تعالیٰ انکی اس لغزش کو معاف فرمائے - اس آیت میں خطاب کی نوعیت بالکل واضح ہے - یا عبادی الذین اسرفوا الآیہ کا خطاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی طرف ہے - اسکے شروع میں جو قُلْ ہے وہ پیغمبر کو خطاب ہے کہ آپ یہ پیغام حرف بحرف بندوں کو پہنچا دیں -

کسی عام کلام کی توجیہ اسکی خاص جہت کے اعتبار سے ایک مستقل باب ہے - تعیین خطاب کا علم اسی باب کا ایک شعبہ ہے - جس شخص پر کلام کا صحیح رخ واضح نہیں ہوگا وہ اس کی صحیح تاویل تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا - پس یہ باب تاویل اور نظم کلام کے فہم کی کلید ہے اور اس سے بے خبری بہت سی غلطیوں اور ٹھوکروں کا سبب ہو سکتی ہے - ایک مستقل مقدمہ[1] میں ہم علم توجیہ کے عام قواعد بھی بیان کرینگے - اصول بیان کرنے سے پہلے یہ مقدمہ ہم نے محض اس لیے لکھدیا ہے کہ فی الجملہ اس مسئلہ سے لوگوں کو اُنس ہو جائے - یہ مسئلہ خطاب ان بہت سی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے جن میں ہمارے مفسرین مبتلا ہیں - پس ضروری ہے کہ ہم اس پر علحدہ بحث کریں -

خطاب میں جب مختلف پہلوؤں کا امکان ہو تو اسکو لفظ مشترک کی طرح سمجھنا چاہیے اور اس میں بعض پہلوؤں کا اخذ اور بعض کا ترک ناگزیر ہے - جس طرح ایک لفظ مشترک کے تمام معانی کو ہم معلوم کرتے ہیں اور پھر سیاق کلام کی روشنی میں کسی معنی کو اخذ کرتے اور بقیہ کو چھوڑتے ہیں وہی طرز عمل ہمارا اس وقت ہوگا جب کوئی خطاب محتمل الوجوہ ہو - لہذا اولین شئے

۱؎ اس مسئلہ کی پوری توضیح مولانا ؒ نے اصول التاویل اور کتاب الاسالیب میں فرمائی ہے - یہاں یہ بحث ناتمام رہگئی ہے (مترجم)

اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہم خطاب کے وجوہ معلوم کریں۔

خطاب میں ایک مصدر ہوتا ہے اور ایک منتہٰی۔ مصدر یا تو اللہ تعالیٰ ہوگا، یا جبریل، یا رسول، یا لوگ۔ اسی طرح منتہیٰ یا اللہ تعالیٰ ہوگا، یا رسول، یا لوگ۔ لوگوں میں، مسلمان ہونگے، یا منافقین یا اہل کتاب، یا ذریت اسمٰعیل، یا ان میں سے دو یا تین یا سب۔ اہل کتاب میں سے یا تو یہود ہونگے یا نصاریٰ یا دونوں۔ یہ پہلو تو ظاہر ہیں۔ اب انکے اختلاط و التباس کی صورتوں پر غور کرنا چاہیے مصدر میں التباس اللہ تعالیٰ، رسول اور جبریل کے مابین ہوتا ہے۔ اگر تم بغیر تنبہ کے قرآن پڑھتے چلے جاؤ تو یہ امتیاز مشکل ہوگا کہ کون قائل ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ یہ کبھی مُرسِل کا قول نقل کرتے ہیں، اور کبھی وہ بات ادا کر دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انکی زبان پر جاری فرمائی ہے۔ پھر حضرت جبریل اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ یہ کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محض مبلغ کلام الٰہی کی حیثیت سے کلام کرتے ہیں اور کبھی آپکے معلم کی حیثیت سے، اور انکے معلم ہونے کی حیثیت خود اللہ تعالیٰ نے واضح کر دی ہے۔ عَلَّمَهٗ شَدِیۡدُ الۡقُوٰی، ذُوۡ مِرَّۃٍ فَاسۡتَوٰی۔

پھر یہ تمام حیثیات ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی بغیر کسی تنبیہ کے نمایاں ہوتی ہیں اور سیاق کلام کے سوا کوئی اور چیز اس باب میں رہنمائی کرنے والی نہیں ہوتی۔ اور یہ بات کچھ قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ یہ چیز معاملہ رسالت کی خصوصیات میں سے ہے۔ زبور میں بھی اسکی مثال موجود ہے۔ دیکھو ۴٦ آیات ۷ - ۱۱ "لشکروں کا خداوند ہمارے ساتھ ہے..... خاموش ہو جاؤ اور جان لو کہ میں خدا ہوں......... لشکروں کا خداوند ہمارے ساتھ ہے۔" قاعدہ کلیہ اس باب میں یہ ہے کہ جب کلام صریحاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا تو اس میں جلال و ہیبت اور رعونت و سطوت کا اظہار ہوگا۔ لہذا اس طرح کا کلام ضرورت کے مواقع پر نمودار ہوتا ہے۔ ہم یہاں بعض مثالیں

پیش کرتے ہیں تاکہ ہمارا مدعا سمجھنے میں تم کو آسانی ہو۔

مثلاً سورہ اقرا، شروع سے حضرت جبریل کی زبان سے ہے۔ لیکن جب غصہ کے اظہار کا موقع آیا ہے کلام صراحت کے ساتھ خدا کی طرف سے ہو گیا ہے۔ كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ...... (یہ کچھ نہیں، اگر باز نہ آیا ہم چوٹی پکڑ کر گھسیٹیں گے)۔

منتہیٰ میں التباس نبی اور مومنین کے مابین ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ بظاہر مخاطب پیغمبر ہوتا ہے حالانکہ اصلی روئے سخن امت کی طرف ہوتا ہے۔ پیغمبر چونکہ امت کے وکیل ہونے کی حیثیت سے انکی زبان اور ان کا کان ہوتا ہے اس لیے اسکو مخاطب کیا جاتا ہے۔ تورات میں اسکی بہت مثالیں ہیں کہ مخاطب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بصیغۂ واحد کیا گیا ہے اور مراد انکی امت ہے۔ قرآن مجید میں، اس طرح کے مواقع میں نظم و سیاق کی رہنمائی سے معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب کون ہے۔ سورۂ توبہ میں ایک آیت ہے إِن تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكَ مُصِيبَةٌ يَقُولُوا قَدْ أَخَذْنَا أَمْرَنَا مِن قَبْلُ (اگر تم کو بھلائی پہنچتی ہے تو انکو تکلیف ہوتی ہے اور اگر کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں خوب ہوا ہم نے اپنا بچاؤ پہلے کر لیا)۔ یہاں خطاب واحد کا ہے لیکن مراد اس سے عام مومنین ہیں۔ چنانچہ اسکے جواب سے اسکی وضاحت ہو گئی ہے۔ قُل لَّن يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (کہہ دو نہیں پہنچیگی ہم کو کوئی مصیبت مگر جو اللہ نے ہمارے لیے لکھدی ہے وہ ہمارا مولا ہے۔ اور چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں اہل ایمان) اسی طرح سورہ بنی اسرائیل میں مخاطب پیغمبر صلعم کو کیا ہے اور خطاب امت کی طرف ہے۔ مثلاً إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا (اگر تمہارے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچیں تو نہ انکو اُف کہنا اور نہ جھڑکنا اور اُن سے ادب کی بات کہنا) اس طرح کی متعدد مثالیں عام خطاب کی ہیں۔ سورہ بقرہ میں ہے أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ۔
اسی قاعدہ پر ہم آیت ذیل کو بھی محمول کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (بیاض)

مقدمہ (۱۶)

کیفیت نزول

یہ بات خود قرآن مجید سے معلوم ہے کہ قرآن یک دفعہ نہیں نازل ہوا ہے۔ وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيْلًا۔

اسی طریق پر قرآن موقع کے لحاظ سے نازل ہوتا تھا۔ پھر جب کسی حکم کی تخفیف یا تکمیل نازل ہوتی تو یا تو اسکو سابق حکم کے ساتھ رکھا جاتا یا سب کے آخر میں تتمہ کے طور پر۔ اور ابواب کے درمیان فصل صرف رکوع کے ذریعہ سے کیا گیا ہے اس وجہ سے ان تتموں کی مناسبت معلوم کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ سورۂ قیامہ میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلعم سے وعدہ کیا تھا کہ جو باتیں محتاج توضیح ہونگی ان کی خدا کی طرف سے وضاحت کی جائے گی۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ۔ اس وعدہ کے مطابق جب اللہ تعالیٰ نے کسی بات کی وضاحت فرمائی تو اس پر متنبہ بھی فرما دیا۔

علاوہ ازیں اس قسم کے تتمے جہاں جہاں ہیں انکا اسلوب ماقبل کے اسلوب سے عموماً مختلف ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تتمہ ہے۔

بعض مقامات میں انکی نوعیت ایسی ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی سوال مقدر کا جواب دیا گیا ہے، یا کسی امر غامض پر تنبیہ کی گئی۔

ان امور کے علاوہ یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ بعض سورتیں آنحضرت صلعم کی زبان سے

ادا ہوئی ہیں، بعض حضرت جبریل کی اور اکثر براہِ راست لسان الٰہی سے ۔ یہی انداز قدیم صحیفوں میں بھی ہے ۔ قرآن مجید میں اسکی پوری وضاحت بھی فرمادی گئی ہے ۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ	کسی بشر کی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام
اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ	کرے، مگر وحی کے ذریعے یا پردہ کی آڑ سے یا بھیجے کوئی رسول
يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ	(روح القدس) پس وہ (یعنی رسول قدسی) وحی کرے اس کے (اللہ کے) اذن سے جو وہ چاہے ۔

دوسری جگہ ہے ۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ	کہدو جو جبریل کا دشمن ہے تو اس نے اسکو (قرآن کو)
فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ	اتارا ہے تمہارے دل پر اللہ کے حکم سے ۔

ایک اور مقام میں فرمایا ہے ۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ	یہ ایک رسول گرامی کا قول ہے، جو زور والا،
ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ	صاحبِ عرش کے یہاں درجہ پائے ہوئے، مانا ہوا اور وہاں معتبر
مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ	ہے ۔ اور تمہارا رفیق مجنون نہیں اور اس نے اُسے دیکھا
وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ وَمَا هُوَ	آسمان کے صاف کنارے ہیں اور وہ غیب کا حریص نہیں اور
عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ	یہ شیطان رجیم کی بات نہیں ۔
شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ	

نیز فرمایا ۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ وَمَا	یہ ایک رسول گرامی کا قول ہے ۔ یہ کسی شاعر کا کلام
هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ وَ	نہیں ہے ۔ تم بہت کم ایمان لاتے ہو ۔ اور نہ کسی کاہن کا کلام ہے
لَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ	تم بہت کم سوچتے ہو ۔ اتارا ہوا ہے عالم کے پروردگار

تَنْزِيلًا مِّن رَّبِّ الْعَالَمِين۔ کی طرف سے۔

اس پر پوری بحث ہم نے اپنی کتاب اسالیب القرآن میں کی ہے۔

مذکورۂ بالا تفصیل سے تم کو معلوم ہوا کہ قرآن میں بہت سی آیتیں تتمہ اور بیان کے طور پر ہیں، بہت سی آیتیں حضرت جبریل کی زبان سے ہیں، بہت سی آیتیں آنحضرت صلعم کی زبان سے ہیں، بہت سا کلام بلا واسطہ خدا کی زبان سے ہے۔ تو لازماً آیات کا نظام سمجھنے کے لیے تم کو ان تمام اقسام میں امتیاز کرنا پڑے گا۔ اسکے بغیر نظام کے سمجھنے میں تمہیں دشواریاں پیش آئینگی۔ اسکو عام مثال سے یوں سمجھ سکتے ہو کہ ایک تمثیلی قصہ میں مختلف اشخاص اپنی اپنی حیثیت سے مختلف باتیں کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ گمان کرلے کہ یہ سب ایک ہی شخص کی زبان سے ہے تو اس کو کلام کا ربط سمجھنے میں کیسی زحمت پیش آئے گی۔ یہ بات ہم نے بطور مثال صورت حال سمجھانے کے لیے کہی ہے ورنہ کلام الٰہی ان مثالوں سے بہت ارفع ہے۔

دین میں جذباتی عنصر

از جناب سید محمد نواز صاحب ایم ۔ اے

ارباب حکمت و فلسفہ سے اُلجھے بغیر شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان جسم، عقل، اور روح کا مجموعہ ہے۔ کم از کم اس سے تو کوئی بھی انکار نہیں کریگا کہ انسان اپنی زندگی میں جن فطری ضروریات سے دوچار ہوتا ہے وہ اکثر انہی تین چیزوں میں سے کسی ایک سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ تین قوتیں اپنی اپنی مناسب خوراک کا مطالبہ کرتی ہیں، اور جس طرح فرد اور جماعت کے درمیان صحیح توازن قائم کرنا اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے، عین اسی طرح خود انسان کے اندر ان مختلف مطالبوں کا بہ یک وقت متوازن طریق سے پورا کرنا انفرادی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

دُنیا میں جس قدر نظامات حیاتِ انسانی کے لیے پیش کیے گئے، آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اسی مسئلہ کو حل کرنے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش کی۔ لیکن اکثر ایسا ہوا کہ وہ ان تین قوتوں کو موزوں طریقہ سے مرتب (Adjust) نہ کر سکے۔ چنانچہ بدھ مت نے دنیا کے سامنے ایک ایسا روحانی نظام رکھا جس میں نہ صرف عقل اور بدن کے مطالبات کو نظر انداز ہی کیا گیا بلکہ انہیں کچل دینے پر روحانیت کی بنیاد رکھی گئی۔ اسی طرح عیسائیت جب بگڑ گئی تو اُس نے بھی ایک ایسا فلسفۂ حیات پیش کیا جو عقل و بدن کے مقتضیات کی نفی پر مبنی تھا، جس نے رہبانیت اور للہیت کو ایک ہی چیز سمجھا، جس نے اپنے پجاریوں پر شادی تک کرنا حرام قرار دیا اور جس نے عدم تشدد کا ایک ایسا نظریہ پیش کیا جس پر آج تک عملی طور پر دُنیا کی ایک قوم بھی کامیابی سے عمل

پیرا نہ ہوسکی - برعکس اسکے دورِ حاضر میں مثال کے طور پر کیمونزم ایک ایسا مادّی نظام پیش کر رہی ہے جو انسان کی اُن ضروریات کا قائل ہی نہیں جنہیں "روحانی" کہا جا سکے - جو انسان کو سر سے پاؤں تک معدہ ہی معدہ تصور کرتا ہے اور محض اقتصادیات ہی کو انسان کا بنیادی مسئلہ قرار دیتا ہے - یہ اسی افراط و تفریط کا نتیجہ ہے کہ آج مغرب میں لامذہبیت پھیلتی چلی جا رہی ہے، کیونکہ کوئی مذہبی نظام، کوئی قدیم و جدید مسلک، ان لوگوں کو انسان کے بوقلموں اور مختلف النوع مطالبات کا سامنا کرتا ہوا نظر نہیں آتا، کسی میں ایک قسم کی کمی ہے تو کسی میں دوسری قسم کی۔

دینِ کامل اور فطرتِ انسانی کے مختلف مطالبات

ظاہر ہے کہ ایک کامیاب مسلک وہی ہو سکتا ہے جو فطرت انسانی کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھے، آدمی کی فطرت جن مختلف عناصر سے مرکب ہے اُن سب کی اہمیت محسوس کرے، اُنکے مطالبات سے گریز کرنے یا انکے وجود سے انکار کرنے کے بجائے اُنکا سامنا کرے اور ہر ایک کو اُسکی اہمیت کے مطابق نشو و نما پانیکا موقع دے -

اس حیثیت سے ایک اسلام ہی آپ کو ایسا نظامِ حیات نظر آئیگا جس نے تلخ سے تلخ حقیقت کا سامنا کرنے سے دریغ نہیں کیا - انسان کی جسمانیت ایک حقیقت ہے، اس سے گریز ممکن نہیں - اسلام نے بدھ مت کی طرح نہ اسکا انکار کیا اور نہ اسے کچلنا چاہا، بلکہ مناسب حدود کے اندر اسکو نشو و نما کی آزادی دی - اسی طرح انسان کے اندر عقل کی بے پناہ تنقیدی قوت موجود ہے - اسلام نے قرونِ وسطیٰ کے پادریوں کی طرح اسکی زبان بندی نہیں کی، آدمی کے سامنے ہندو دھرم کی طرح مابعد الطبیعات اور "مافوق الادراکیات" کا ایک گورکھ دھندا پیش نہیں کیا - اسلام سب سے اول ایک علمی و عقلی نظامِ حیات ہے جو اپنے آپ کو انسان کی ہر لمحہ ارتقا کرتی ہوئی عقل کے سامنے پوری بیباکی کے ساتھ پیش کرتا ہے -

لیکن اسلام صرف یہی نہیں، بلکہ اس سے زائد بھی کچھ ہے - وہ محض انسان کے دماغ ہی

کو اپنا قائل نہیں بناتا بلکہ اُس میں اگر ایک طرف جسم کے مقتضیات اور عقل کے مطالبات فطری حد تک پورے کیے گئے ہیں تو دوسری طرف قلبی بے اطمینانیوں اور روحانی بے قراریوں کا نہ صرف اعتراف ہے بلکہ علاج بھی موجود ہے۔

عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب! ‏ تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے

قرآن میں اطاعتِ توحید کے لیے انسان کو جس قدر اُبھارا گیا ہے، اُس میں آپ دیکھیں گے کہ کبھی تو منطقی استدلال سے کام لیکر عقلِ انسانی سے اپیل کی گئی ہے اور کبھی عقل کو بالائے طاق رکھ کر براہِ راست اُن جبلی و وجدانی جذبات کو بیدار کیا گیا ہے جو فطرتِ انسانی میں پیوست کر دیئے گئے ہیں، اور کبھی عقل، قلب، وجدان غرضیکہ سبھی عناصر کو بیک وقت مخاطب کیا گیا ہے۔ مجموعی حیثیت سے شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ قرآن کا مخاطب عقل سے زیادہ قلب ہے۔ کیونکہ "قلبی شہادت" اور "وجدانی تصدیق" (Intuitive perception of truth) ہی ایمان بالغیب کی متحمل ہو سکتی تھی جو قرآن سے ہدایت پانے کی اہلیت کے لیے شرطِ اولین اور اتقا کا سب سے پہلا معیار ہے۔ ھُدًی لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ ......

قرآن میں محبتِ الٰہی کا تصور اور خطاب سے ہٹ کر اب ذرا خودِ خطاب کی طرف دیکھیے، اللہ خالق ہے اور حاکم۔ بندہ مخلوق ہے اور محکوم۔ صرف یہی دلیل آدمی کو خدا کی اطاعت پر عقلاً مجبور کر سکتی ہے۔ لیکن قرآن کریم نہ صرف خالقیت کی بنا پر خدا کی اطاعت ہی کی تعلیم دیتا ہے، یعنی نہ صرف انسان سے عقلی بیعت ہی لینا چاہتا ہے، بلکہ خالق کے ساتھ مخلوق کو "محبت" پیدا کرنے کی تلقین کرتا ہے، یعنی عبد و معبود، حاکم و محکوم کے درمیان ایک جذباتی اور روحانی رشتہ بھی قائم کرنا چاہتا ہے جس کے بغیر محض عقلی بیعت کی بنا پر قائم شدہ اطاعت ایک جسدِ بے روح کی مانند ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ‏ اور لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا اور

أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۖ　　معبود بنا لیتے ہیں اور اُن سے محبت کرتے ہیں جس طرح
وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۔　　اللہ سے کرنی چاہیے۔ مگر جو مومن ہیں، وہ تو سب سے زیادہ
(بقرہ - ۱۶۵)　　اللہ ہی سے محبت کرتے ہیں۔

فطرتِ انسانی کے وہ مبہم حصے جو عقل اور جسم کے مطمئن ہوجانے پر بھی تشنۂ تسکین رہتے ہیں، اُنکو اللہ میاں نے اپنی ذات کی محبت کی طرف منعطف فرما دیا ہے، تاکہ یہ کسی اور رَو میں نہ بہہ جائیں، اُنکی قوت کسی اور رستہ میں صرف نہ ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص رُوسو، نطشہ، یا مارکس سے عشق کیے بغیر بھی اُسکے فلسفۂ حیات کا پیرو ہو سکتا ہے۔ لیکن قرآن کے نزدیک محض اتباع مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصودِ اصلی تو اللہ کی محبت اور رضاجوئی ہے۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي　　کہدو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو،
يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۔　　اللہ تم سے محبت کریگا اور تمہاری خطائیں ڈھانپ لیگا،

اور یہ محبت محض یک طرفہ نہیں۔ بلکہ اُس طرف سے بھی نہ تو صرف عذابِ آخرت سے ڈرایا ہی جارہا ہے اور نہ صرف نجات اور جنت کے وعدے ہی ہورہے ہیں بلکہ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اور فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ کے پختہ مواثیق ہورہے ہیں، رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ کی سند مل رہی ہے اور:

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ　　پس اللہ ایسی قوم پیدا کریگا جس سے وہ محبت کریگا
يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (المائدہ - ۵۴)　　اور جو اس سے محبت کرے گی۔

کا پیمان کیا جارہا ہے۔

اب خیال کیجیے کہ اس سے بلند تر معراج انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ خدا کا محِب ہو اور خدا اس کا؟ قرآن نے انسان کا جو تصور پیش کیا ہے اِس سے بڑھ کر کونسا فلسفہ ہے جو اس احسن تقویم کو اور زیادہ بلند کرسکے۔ اور وہ قلبی جذبات محبت جو انسان کی فطرت میں ودیعت

کیے گئے ہیں، انکی تسکین و قرار کا ذریعہ اس سے بلند تر اور پاکیزہ تر کیا ہو سکتا ہے کہ محبتِ خداوندی کو اُنکا منتہا اور مطمحِ نظر قرار دیا جائے [۱]

قرآن کا اسلوب بیان | اب ایک لمحہ کے لیے معنوی حیثیت سے قطع نظر کر کے قرآنِ حکیم کے اسلوبِ بیان پر غور کیجیے - نزولِ قرآن نے ایک طرف معنویت کے لحاظ سے ایک انقلابِ عظیم برپا کیا اور دوسری طرف اسلوبِ بیان (style) کے نقطۂ نظر سے عربی ادبیات کی تاریخ میں بالکل ایک نئے طرزِ کلام کی بنا ڈالی، جسکی تنزل یافتہ شکل ہم مقاماتِ حریری اور اسی سلسلہ کی اور کتب میں دیکھتے ہیں [۲]- اب وہ مجموعی تأثر جو قرآن کے مطالعہ سے پیدا ہوتا ہے اُس کا تجزیہ کیجیے تو آپ دیکھینگے کہ ایک طرف تو قرآن کے حکیمانہ مطالب عقل و دماغ کو اپیل کر رہے ہیں

[۱] جن قوموں کے مذاہب انسان کے جذباتی عناصر کی تسکین کا سامان فراہم نہیں کرتے، ہم دیکھتے ہیں کہ اُنکے جذبات خود بخود غلط راہیں تلاش کر لیتے ہیں - اُنکی محبتیں اگر ایک طرف انفرادی زندگی میں اکثر محض عورت ہی کے وجود پر مرتکز ہو کر رہ جاتی ہیں، حتیٰ کہ اُن کا لٹریچر ابتدا سے آخر تک تمام تر عورت ہی کی پرستش سے معمور ہوتا ہے اور ع

آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

کا مصداق ہوتا ہے تو دوسری طرف اجتماعی زندگی میں اُن کے تمام جذبات نسل پرستی یا وطن پرستی یا قوم پرستی میں ضائع ہو جاتے ہیں، اور اُنکی سب خواہشیں سمٹ کر جُوع الارض کی خونخوار شکل اختیار کر لیتی ہیں اور اُنکی تمام محبتیں ع

کھا گئی روحِ فرنگی کو ہوائے زر و سیم

کا عبرتناک منظر پیش کرتی ہیں -

[۲] ادبی حیثیت سے مقامات وغیرہ کے تنزل کی وجہ یہ تھی کہ یہاں صرف اسلوب ہی (اور وہ بھی غلط طریق سے) قرآن سے لے لیا گیا تھا، اور وہ حسین معنویت جو اصل میں اُس حسین اسلوب کی محرّک و مقتضی تھی وہ آتشیں صداقت جس نے آیاتِ قرآنی کا شعلہ فشاں لباس پہنا، وہ خاص سپرٹ جسکے لیے وہ مخصوص جسم طبعاً لابدی تھا، یہ تو یہاں غائب تھی، محض جسم مانگ لیا گیا تھا اور لباس پہنا دیا گیا تھا - معنویت اور اسلوب کے درمیان جو طبعی تعلق اور لزومیت ہونی چاہیے اس کا سرے سے وجود ہی نہ تھا -

اور دوسری طرف اُسکے الفاظ کا ترنم، سجع، ترصیع، وزن اور قافیہ کا وہ عجیب استعمال جو محض اپنے ہی قوانین کا متبع ہے اور جو تمام بیرونی پابندیوں سے بے نیاز ہے یہ سب کچھ نادانستہ طور پر ہمارے قلبی جذبات کو بھی مسحور کر رہا ہے۔ اور ان دونوں کا مجموعی نتیجہ ہے وہ "الہٰی نغمہ جسکی آواز ہی سے آدمی کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں" [۱] اگرچہ ظاہر ہے کہ قرآن کی محض ادبی نقطۂ نظر سے تنقید نہیں کی جا سکتی (اور شاید یہی خوف ہے جس نے آج تک علمائے اسلام کو اسلوبِ قرآن کے بارہ میں نسبتاً خاموش رکھا ہے) تاہم قرآن کی بلند پایہ شعریت جو شاعری نہیں لیکن شاعری سے زیادہ مؤثر ہے، اور اُسکی پاکیزہ ادبیت، ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ یہی چیز ہے جسے ہم عموماً قرآن کی "فصاحت" (Eloquence) کہتے ہیں۔ اور اسکا ثبوت یہ ہے کہ اگر آپ قرآن کی کوئی سورت مثلاً سورہ کوثر کو لے کر اُس میں کوثر، وانحر اور ابتر کی جگہ انکے مُرادفات لگا دیں یا مثلاً سورۂ النجم کی ابتدائی آیات والنجم اذا ھوی، ما ضلّ صاحبکم وما غوی، وما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحیٌ یوحیٰ میں آخری الفاظ کی بجائے انکے ہم معنی الفاظ لگا دیں تو اگرچہ مفہوم وہی رہیگا لیکن آپ دیکھینگے کہ وہ جذباتی تاثر (Emotional response) جو پہلی صورت میں پیدا ہوا تھا، ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ قرآن ایک حسین حقیقت ہے جس نے طبعی اور لازمی طور پر ایک حسین لباس پہن رکھا ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے اثر کو مجروح کیے بغیر ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے [۲]

---

۱ "That Divine symphony the very sound of which moves me to tears" Marmaduke Pickthall : Preface to *The Meaning of the Glorious Quraan.*

۲ یہی وجہ ہے کہ قرآن کا "ترجمہ" (Translation) نہیں کیا جا سکتا، صرف مطالب بیان کیے جا سکتے ہیں۔

اس تمام بحث سے میرا مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ قرآن کے معانی اور اسلوب دونوں اپنے اندر عقلی اپیل کے علاوہ ایک جذباتی اپیل بھی رکھتے ہیں جو اکثر اوقات غیر شعوری طور پر یا نیم شعوری طور پر انسان کو متاثر کرتی ہے۔ قرآن نے اسکی ضرورت اسلیے محسوس کی کہ انسان محض ایک "عقلی حیوان" (Rational animal) ہی نہیں ہے بلکہ اسکی فطرت دوسرے اجزاء سے بھی مرکب ہے۔ اُس میں روحانی اور جذباتی عناصر بھی موجود ہیں۔ اور اسلام دین فطرت ہونے کے لحاظ سے وجود انسانی کے تمام پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتا ہے اور اپنی اپیل کو مکمل بنانے کیلیے لازماً جذبات کو بھی حرکت میں لاتا ہے۔

جذباتی عنصر کی تعریف | انسان کے اندر اور اسلیے دین کے اندر، جو جذباتی عنصر موجود ہے، اسکی تعریف اور تعیین، سائنٹفک الفاظ میں کردینا میری بساط سے باہر ہے۔ غالباً اسکی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ چیز طبعاً اور لازماً ناقابل تعریف ہے۔ اسے محسوس کیا جاسکتا ہے، پر اسکا اظہار مشکل ہے ہمیں احساس ہے کہ انسان اپنی عقلی حدود سے پرے جانے کی کوشش کرتا ہے، اپنے افقِ نگاہ سے بعید کسی اور مملکت کو دیکھنے کے لیے بیتاب ہوتا ہے، اُسکے اندر ایک قلبی خلش ہوتی ہے کہ اس عالمِ چار سو کو پھاند کر لامکاں کی غیر محدود وسعتوں میں کھو جائے۔ ہمیں اِسکا بھی احساس ہے کہ دین اِن تمام مبہم آرزوؤں کا جواب اپنے اندر رکھتا ہے۔ اِن تمام بے قراریوں کی تسکین اُسکے پاس موجود ہے جو کبھی قلبِ انسانی کو مخاطب کلام اللہ بناتی ہے، کبھی محبت الٰہی کا دلآویز تخیل پیش کرتی ہے، اور کبھی آیاتِ الٰہی کا "سحرِ حلال" بن کر انسان کے تمام وجود کو مسحور کر لیتی ہے۔

سرحد ادراک

ہم یہ سب کچھ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہم سے کوئی پوچھے کہ انسان کے اندر اور دین کے اندر جو یہ فوق الادراکی عنصر (Super-rational element) پایا جاتا ہے یہ کیوں ہے اور کیا ہے تو شاید ہم کوئی واضح جواب نہ دے سکیں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ یہ عنصر جن جن مختلف صورتوں میں ہمیں نظر آتا ہے، وہ بیان کر دیں۔ اور دین کی تاریخ میں یا دین کے ارکان میں جہاں کہیں ہمیں یہ

چیز کارفرما نظر آئے، اسکی مثال پیش کردیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی مثالیں بہت سی ہونگی جو بہ یک وقت سب کی سب مدنظر نہیں رکھی جاسکتیں، لہٰذا ان دو تین مثالوں کے علاوہ جو اوپر بیان کردی گئی ہیں، کچھ اور مثالیں پیش کی جائینگی جن میں سوائے اسکے کہ وہ جذباتی عنصر کی مختلف صورتیں ہیں، ان سے اور کوئی تعلق نہ ہوگا۔

فلسفۂ نماز سب سے پہلے نماز کو لیجیے۔ دن میں پانچ دفعہ نماز پڑھنے سے جو یاددہانی ہوتی رہتی ہے جو فرض شناسی، پابندیٔ وقت، اور تعمیر سیرت ہوتی ہے، یہ تمام نماز کے خارجی فوائد اور لوازم ہیں۔ اسکی اندرونی توجیہہ (internal phenomenon) یہ ہے کہ انسان میں خداپرستانہ جذبات جبلّی طور پر موجود ہیں اسی لیے قرآن مدعی ہے کہ ہم نے لوگوں کو فطرتِ اسلام پر پیدا کیا (فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا)۔ اور جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے (کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ و ینصرانہ و یمجسانہ او کما قال) یہ جذبات اکثر اوقات کئی خارجی اثرات کی وجہ سے یا دب جاتے ہیں یا کسی اور معبود کی طرف منعطف ہوجاتے ہیں نماز ان جذباتِ وجدانی کی بہ یک وقت انگیخت اور تسکین کا نام ہے۔ معبود کی عبادت کی حِس عبد کی فطرت میں پیوست کردی گئی ہے اور نماز اُس حس کو بار بار بیدار کرنے اور بہ یک وقت تسکین دینے کا ذریعہ ہے۔ اور وہ نماز جو انسان کے اُن وجدانی جذبات کو بیدار نہیں کرسکتی جو ایک فطری حس کے طور پر اُس میں موجود ہیں، اپنے مقصد کو فوت کردیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ نماز اِس طرح پڑھو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو یا کم از کم اِس طرح گویا خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔ عبد و معبود کے درمیان قربت کا یہی رشتہ قائم کرنا نماز کا جذباتی مقصد ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر ایک خدا کی ہستی کا اقرار اور اسکے مقتضیات کی تعمیل محض عقلی طور پر کردینا ہی مقصود واحد ہوتا تو دن میں پانچ مرتبہ خاص خاص اوقات پر خاص خاص طریقوں سے عبادت کرنے کو شاید اتنی اہمیت نہ دی جاتی۔

اسلامی تاریخ میں جذبات کی مثالیں | ایک طرف خداوندِ قدوس آدمی کے اندر اپنی ہستی کا شعور عقل و فکر کے ذریعہ سے پیدا کرتے ہیں (اسی لیے اَفَلَا یَتَفَکَّرُوْنَ، اور اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ کی عبرت آموزیاں قرآن کے صفحات میں سے چمک رہی ہیں) دوسری طرف خداوندِ اکبر اپنی ذات کی محبت قلوب کے اندر وجدانی جذبات کی بیداری سے پیدا کرتے ہیں۔ اسی لیے اہل ایمان کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ۝ (الانفال ۔ ۲)	جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، ان کے دل کانپنے لگتے ہیں اور جب اللہ کی آیات انکے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو انکا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے پروردگار ہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔
اَلَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (الحج ۔ ۳۵)	وہ لوگ جو خدا کا ذکر سنتے ہیں تو ان کے دلوں میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔

اسلامی تاریخ ایسے واقعات کی بہت مثالیں پیش کرتی ہے، جن میں عقلی تجسس سے زیادہ محض جذباتی اپیل نے کام کیا۔ جس حد تک جذباتیات نے اشاعتِ اسلام میں حصہ لیا، اس کا ہم صحیح اندازہ لگانے سے قاصر ہیں۔ اکثر دفعہ ایسا ہوا کہ لوگ محمدؐ ابن عبداللہ کی شخصی صداقت و امانت ہی کی بنا پر رسول اللہ کے دعویٰ رسالت پر ایمان لائے۔ انسان کی شخصیت کا طلسم نبیؐ کے معجزۂ نبوت کا معاون ہوا۔ "السابقون الاولون" میں سے کونسا ایک فرد بھی ایسا ہے جس نے اسلامی نظام کی تمام جزئیات میں جانے کی ضرورت محسوس کی ہو (جو سرے سے ابھی مرتب ہی نہیں ہوا تھا)۔ ان کے لیے اُس سرچشمۂ صدق و صفا کا دعوے ہی فقط اپنی دلیل آپ تھا۔ حضرت صدیقؓ اکبر اور معراج کا واقعہ ہمارے سامنے ہے ظاہر ہے کہ یہ واقعہ حدودِ عقل سے ورا ہی نظر نہیں

آتا تھا بلکہ عقل کی عین ضد تھا - اس وقت کس چیز نے صدیقؓ کو اسکی صداقت کا یقین دلایا؟ یہ محض وہ جذباتی رشتۂ عقیدت تھا جو اُنکے دل میں رسولِ خدا کی ذات سے وابستہ تھا -

پھر فاروقِ اعظمؓ کے اسلام لانے کا واقعہ یاد کیجیے - ظاہر ہے کہ اُس وقت انہیں اسلام کے اجتماعی فلسفہ، اسلام کے اخلاقی یا اقتصادی نظام پر غور کرنے کی نہ فرصت تھی نہ خواہش، نہ ہی انہیں پرانے فلسفۂ حیات کو عقلاً غلط تسلیم کرنے کا موقع ملا (نئی تحریک کی جدت طرازیوں کا تھوڑا بہت مطالعہ انہوں نے ممکن ہے کیا ہو، لیکن وہ بھی ایک خالص دشمن کے نقطۂ نظر سے) اس پر طرّہ یہ کہ ارادۂ قتل سے جانیوالا آدمی لازماً ان عقیدتمندانہ جذبات سے بھی عاری تھا جو ایک خدیجہؓ، ایک علیؓ، یا ایک صدّیقؓ کے لیے مشعل ہدایت بن سکتے تھے - پھر کیا چیز تھی جس نے یکایک ذہنیت میں ایسا انقلابِ عظیم برپا کیا؟ یہ چند آیات قرآنی کی سماعت تھی، اُس "الٰہی نغمہ" کی موسیقی تھی، اور وہ جذباتی تموّج تھا جو قرآن کی آیات پیدا کرنے پر قادر ہیں - اُدھر فاروقؓ کے ایمان لانے کی تاریخی اہمیت کا اندازہ لگائیے اور پھر اس واقعہ کے اسباب پر غور کیجیے - آپ حیران رہ جائینگے کہ ایک لمحہ کے جذباتی تأثر نے کیا کام کر دکھایا!

جذبات کی کارفرمائیوں کی مثالیں جتنی چاہییں مل سکتی ہیں - اویسؓ کا واقعہ تو ایک انتہائی مثال ہے - لیکن صرف اُن غلاموں اور کنیزوں کے ناموں ہی پر نظر دوڑانا کافی ہوگا جو تپتی ہوئی ریتوں پر لٹائے جاتے اور جنکے سینوں پر پتھر رکھے جاتے اور پھر بھی اَحَد اَحَد ہی پکارتے - خدا کا کوئی عقلی تصور انسان کے اندر مصائب کی اس قدر مقاومت نہیں پیدا کرسکتا - ابوفکیہہ، بلالؓ، خبّابؓ، عمّارؓ، لبینہؓ، سمیّہؓ، نہدیہؓ کی عقلیں ہی اسلام کی حقانیت کو قبول نہیں کرچکی تھیں بلکہ ایمان ان کے رگ و ریشہ میں سما گیا تھا، اور وہ ایمان کی اُس منزل میں تھے جسے "عشق" کہا جاسکتا ہے - اگر آپ بلالؓ سے اسلام کے سیاسی نظام کے متعلق استفسار کرتے یا لُبینہؓ سے

اسلام کے اقتصادیات پر گفتگو کرتے تو شاید وہ لوگ حیرت سے آپکا منہ تکتے۔ لیکن باوجود اس کے دنیائے اسلام ایسی مثالیں آج تک پیدا کر سکی۔ لاکھ رازی و سینا اُن پر قربان کیے جا سکتے ہیں۔ اور یہ اسلیے کہ فقط اسلام کا علم اور اُسکا بہ حیثیت ایک مسلکِ فکر و عمل کے عقلی طور پر قبول کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ تکمیل ایمان کے لیے ایک اور فطری عنصر کے نشو و نما کی ضرورت ہے جسے ہم جذباتی یا روحانی عنصر[1] کہتے ہیں۔

جذباتی عنصر مختلف ادوار میں

مسلمانوں کی تاریخ پر نظر ڈالنے کا ایک دلچسپ طریق یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اس نقطۂ نظر سے دیکھیں کہ کس کس دور میں مسلمان "علم و عشق" کا وہ صحیح توازن قائم رکھ سکے جو دین کا فطری تقاضا ہے۔ عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ یقیناً ایک ایسا دور ہے جس نے ایسے ایسے لوگ پیدا کیے جو بہ یک وقت عالم اور فقیہہ بھی تھے اور اپنی جانیں شمعِ نبوت پر پروانہ وار نثار کر دینے والے دیوانے بھی۔ جو آج اگر کسی خطبۂ نبوی کو سُن کر زار و قطار رو رہے ہیں تو کل شام و روم کی سلطنتوں کو زیر و زبر کر رہے ہیں۔ وہی آوازیں جو "صوت النبی" سے ملبند ہونے کی ہمت نہیں رکھتیں، دنیا کی فضائیں اُنکے نعرہ ہائے تکبیر سے تھرتھرا رہی ہیں، اور کفر کی سلطنتیں انکی گونج سے لرز رہی ہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی طالب علم جو بے لاگ آنکھوں سے دیکھے، تمام دنیا کی تاریخ میں صدیقؓ، فاروقؓ، عثمانؓ، علیؓ، خالدؓ، ابوذرؓ، سلمانؓ، بلالؓ جیسا گروپ (Group) کسی ملک اور کسی زمانہ میں نہیں دیکھ سکے گا۔ انسانیت کے یہ مکمل ترین نمونے اپنے جامع الصفات ہونے کے لحاظ سے عدیم المثال ہیں۔

---

[1] "جذباتی" اور "روحانی" میں اگر کوئی فرق ہے تو اُسے لازمی طور پر دانستہ نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ غالباً روحانیت کو جذباتی ارتقا کی آخری منزل کہا جا سکتا ہے۔ دراصل ان تمام الفاظ کا مفہوم قدرے مبہم اور غیر متعین ہے۔ لیکن یہ ہمارے بس کی چیز نہیں۔ اور بالآخر ہم سائنس یا ریاضی سے دوچار نہیں ہیں کہ بغیر اصطلاحات کی سائنٹفک تعیین کے ہمارا کام نہ چل سکے۔

عصر حاضر غالباً اُس دور کے عین متضاد ہے - کیونکہ یہاں روحانیات کا تو خیر ذکر ہی کیا ما اسلام کا بنیادی ادراک اور شعور ہی مفقود ہے - باقی ادوار کی تاریخ بھی اپنی دوگونہ محرومیوں کی داستان ہے - چنانچہ آپ دیکھینگے کہ کبھی کوئی غزالی اسلامی شعور پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور کبھی کوئی رومی ایمانی جذبات کو بیدار کرنے کی سعی میں ہے -

تصوف کی ابتدا | آٹھویں نویں صدی عیسوی میں اسلامی دنیا کے اندر "تصوف" کی ابتدا کے متعلق بہت سے نظریات (Theories) مشہور ہیں - ایک تو یہ ہے کہ خود قرآن کے اندر بعض آیات (بالخصوص وہ جنہیں "متشابہات" کہا جاتا ہے) اور بعض احادیث (جن میں سے اکثر متنازع فیہ ہیں) میں شجر تصوف کا بیج بو دیا گیا ہے اور جوں جوں خاص خارجی اثرات تاویل قرآنی پر اثر انداز ہوئے، مثلاً بارہویں تیرھویں صدی عیسوی میں ہلاکو اور چنگیز کے معرکوں نے جب بے ثباتی دنیا کا دلخراش منظر پیش کیا تو مذہب میں رہبانی قسم کے تخیلات کا خاص طور پر تجسس کیا گیا اور اس طرح وہ بیج موافق آب ہوا کے اندر پھلا پھولا -

دوسرا نظریہ وہ ہے جسے نسلی ردِ عمل (Racial reaction) کا نظریہ کہا جاتا ہے - اسکی رُو سے تصوف دراصل آرین قوموں کا سامی (Semitic) قوموں کے مسلط کیے ہوئے مذہب کے خلاف ردِ عمل ہے - عجمی بالخصوص ایرانی طبعی طور پر مابعد الطبیعاتی بھول بھلیوں میں کھو جانے کے مشتاق ہیں - اُن پر عربوں نے انکی طبائع کے خلاف ایک عملی مذہب مسلط کر دیا تھا، جسکا لازمی ردِ عمل تصوف کی فلسفیانہ صورت میں نمودار ہوا - غیر مسلم مورخین نے اس نظریہ کو خاص وقعت دی ہے -

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ یونانی علوم کی ترویج، عیسائیت اور بدھ مت کے ساتھ ربط، اِن خارجی اثرات سے جب اسلام متأثر ہوا تو اس کا فطری نتیجہ تصوف تھا -

چوتھا نظریہ یہ ہے کہ اکثر تحریکات کی طرح تصوف بھی ایک اندرونی تحریک تھی جو خود بخود نفسیاتی

وجوہ کی بنا پر ظہور میں آئی اور جو بعد میں خارجی اثرات سے بھی لازماً متاثر ہوئی ۔

حقیقتِ حال جس طرح بھی ہو، ایک بات خاص طور پر قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ تصوف نے عین اُسی عنصر کو اہمیت دی، جسے ہم جذباتی یا روحانی عنصر کہتے ہیں۔ جب سے خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوئی تھی، اسلام کے بدن سے گویا روح غائب ہوگئی تھی۔ یوں تو خلیفہ کا برائے نام انتخاب بھی ہوتا رہا، اسلامی شعائر بھی ظاہری پابندی سے قائم کیے گئے، بنوامیہ اور بنوعباس کے عہد میں دار الافتا بھی اسی طرح قائم تھے جس طرح خلافت راشدہ میں، قضا بھی موجود تھی، مسجدیں آپکو مروان بن عبدالملک کے عہد میں بھی بارونق نظر آئینگی، حج و زکوٰۃ کا سلسلہ بھی باقاعدہ جاری تھا، اسلام ایک مشینی باقاعدگی (Mechanical regularity) اور مشینی بے شعوری کے ساتھ چل رہا تھا۔ باہر سے تو سب کچھ ویسا ہی تھا جیسے پہلے ہوا کرتا تھا لیکن پھر بھی دنیائے اسلام ایک لاش تھی جسکے اندر سے جان پرواز کرگئی تھی۔ ایک گھُن تھا جو اندر ہی اندر اسے کھوکھلا کررہا تھا۔ اور وجہ یہ تھی کہ اللہ کی حاکمیت کے بجائے بندوں کی حاکمیت میں گرفتار رہتے ہوئے بھی لوگ محض ظاہری شعائر کی پابندی کو اسلام سمجھ رہے تھے۔ اور ظاہر بیں آنکھیں دور سے ایک ڈھانچے کو جس میں سے روح غائب تھی، قالب زندہ خیال کررہی تھیں ۔

لیکن بعض حساس طبائع اِس کمی کو محسوس کررہی تھیں۔ اور وہ اپنے زمانہ کے خلاف اگرچہ اجتماعی طور پر بغاوت نہ کرسکیں تاہم اپنی اپنی استطاعت کے مطابق انہوں نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ تصوف دراصل دین کے اُن جذباتی اور روحانی عناصر کا احیا (Renaissance of emotional and spiritual elements in religion) تھا جو اُس دور میں اسلام کی مشینی کارروائی کے اندر کچلے گئے تھے۔ جنیدؒ اور بایزیدؒ اپنے زمانہ کی بے روح علمیت کے خلاف جذبات اور روحانیت کے احتجاج کے نام ہیں ——!

بیعت کا نفسیاتی اثر جذبات کے اس احیاء نے سلسلۂ بیعت کو اپنا آلۂ کار بنایا، کیونکہ بیعت ایک پاکیزہ اور صاحبِ علم و عمل انسان سے ایک جذباتی رشتۂ عقیدت قائم کرکے نہ صرف علمی منازل آسانی سے طے کرو اسکتی تھی بلکہ عملی زندگی کو صالح تر بناتی تھی[1]۔ بیعت کی اصلی سپرٹ یہ تھی کہ ایک ایسے انسان کی صحبت جو فکر و عمل میں اتباعِ رسولؐ کا پیکر ہو ، رشتۂ محبت کے ذریعہ سے بلاواسطہ تعمیرِ سیرت میں معاون ہو جائے ۔ آج ہم بیعت کے صرف تاریک پہلو ہی سے دوچار ہیں۔ لیکن اس دور میں جب اسلام ایک مشین کی طرح چلایا جا رہا تھا ، بیعت کے نفسیاتی اثر کی اہمیت کم نہیں کی جاسکتی ۔ بیعت عین اُسی جذباتی عنصر کی بیداری کا وسیلہ بنی جس کا فقدان عالمِ اسلام کو ایک قالبِ بے جان بنائے ہوئے تھا۔ بیعتِ شیخ کے واسطے سے عبد و معبود کے درمیان ایک جذباتی رشتۂ محبت پیدا کرتی تھی اور محبت عمل پر جس طرح اثر انداز ہو سکتی ہے ، صرف علم و عمل کی بساط سے باہر ہے

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

لیکن کم علم اور نااہل لوگوں کے ہاتھوں بیعت لازماً ایک نہایت خطرناک آلۂ کار بن گئی۔ "فنا فی الوجود"، "فنا فی الشیخ" اور "فنا فی الرسول" کی منزلوں میں سے ایک ایک زبردست خطرات

---

[1] عہدِ رسالت کے مسلمانوں اور بعد کے مسلمانوں میں ایک نہایت بنیادی فرق یہ ہے کہ اگرچہ ظواہر میں اکثر دونوں یکساں ہیں تاہم پہلے مسلمانوں کے قلوب میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت سے ایک والہانہ الفت موجود ہے جو اسلامی شعور کے ساتھ ساتھ اُن کے تمام اعمال کی محرک ہے ۔ بعد میں یہی جذباتی عنصر گم ہے ۔ صوفیائے کرام نے اسی عنصر کو شخصی تورع اور اخلاقِ نبوی کی مثالیں پیش کرکے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ، اور تصوف کی نفسیاتی توجیہہ یہی ہے ۔ یہ ہماری بدقسمتی کہ نیستاں اس قدر نم خوردہ ہو گیا کہ یہ شرارے اسے یکسر جلا نہ سکے ۔

سے معمور تھا، کیونکہ ہر ایک کے مقصود بالذات بن جانے کا خطرہ ہر لحہ لاحق رہتا تھا طریقیت، حقیقت اور معرفت کی راہیں رہزنوں سے پُر تھیں - چنانچہ جلد ہی حدِّ اعتدال سے تجاوز ہوا، اس پر طرّہ یہ کہ اس اندرونی خطرہ کے علاوہ تصوف پہ مسیحیت، یونانیت، اور ہندو فلسفہ کے خارجی خطرات بھی حملہ آور ہوئے، اور عین وہی چیز جو جسدِ بے روح میں روح پھونکنے آئی تھی، ایک مستقل بیماری کی طرح اس جسم کے ساتھ ہمیشہ کے لیے پیوست ہو گئی جسکے جراثیم سے آج کے عقلی دور (Age of reason) کی فضائیں بھی محفوظ نہیں ہیں -

ردِّ عمل حدِّ اعتدال سے تجاوز کا نتیجہ طبعی طور پر ایک ردِّ عمل کی صورت میں نمودار ہوا۔ بگڑے ہوئے صوفیوں کی پھیلائی ہوئی بدعات کے خلاف متعدد اصلاحی تحریکیں اٹھیں جن میں سے آخری تحریک کا معروف نام "وہابیت" ہے - اور جب وہابیت خود اعتدال سے منحرف ہوئی تو اس نے پھر اسی قالب بے جان کا نقشہ پیش کر دیا - اگر تصوف یہی روحانیت سے گذر کر باطنیت (Mysticism) بن گیا تو اسکا ردِّ عمل اصلی دینداری سے گذر کر خالی خولی ظاہریت (formalism) بن کر رہ گیا - اس افراط و تفریط کے اندر راہِ اعتدال کسے نظر آتی، اور علم و عشق، افکار و جذبات کا وہ خوبصورت توازن جو اسلام پیش کرتا ہے، کس کو دکھائی دیتا -

اسلامی اور جاہلی جذبات میں فرق حقیقت یہ ہے کہ اسلام جب بھی تحریک کی حیثیت سے ابھرا، اس نے اپنے متبعین سے توقع کی کہ انکی تمام حیات، انکی تمام ہستی، انکے وجود کی تمام قوتیں محض ایک ہی مقصد پر مرتکز ہو جائیں - اُسکی تسلی صرف اس بات سے کبھی نہ ہوئی کہ اُسے محض عقلی و علمی طور پر بہ حیثیت ایک مسلکِ حیات کے تسلیم کر لیا جائے - اُس نے انسان سے عقلی بیعت ضرور لی، لیکن اسی پر اکتفا نہیں کیا - اُس نے اُن تمام نفسیاتی عناصر سے کام لیا جو آدمی کی زندگی پر مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتے ہیں - اُس نے عقل و فکر کے علاوہ آدمی کی جبلت، اُس کے وجدان، اسکے

جذبات، اُسکے "فوق الادراکی" رجحانات، سبھی کو بہ یک وقت حرکت دی - کیونکہ انسان کی تمام مختلف قوتیں کسی مقصد کیلئے مجتمع اور مرتکز ہو ہی نہیں سکتیں جب تک کہ اُن سب کو بیدار نہ کیا جائے - اگر اسلام محض چند عقائد کا مجموعہ ہوتا یا اُسکا مقصد صرف اتنا ہوتا کہ بعض خاص خاص نظریات ذاتِ خدا سے متعلق یا حیات بعد موت وغیرہ سے متعلق پھیلا کر اپنے آپ کو سبکدوش سمجھے، تو شائد اُسے فطرتِ انسانی کے تمام بوقلموں عناصر کو مدنظر رکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی - لیکن اُسے عملی طور پر دنیا میں ایک پوری تہذیب کی بنیاد ڈالنی تھی -

جاہلیت کی یہ خاص کمزوری ہے کہ وہ "پورے آدمی" (The whole of man) کو کبھی اپیل نہیں کر سکتی - بعض مذاہب کی عبادات، شراب و کباب، اور راگ رنگ کی صورت اختیار کر گئی ہیں - کئی اور قدیم اقوام کے ہاں ناٹک، سانگ اور "مذہبی ناچ" ہوتے ہیں جو حاضرین پر ایک خاص قسم کا جذباتی تأثر پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتے - لیکن وہ تأثر اس سے چنداں مختلف نہیں ہوتا جو ایک فوج کے لباس اور بیرونی ٹیپ ٹاپ دیکھنے سے وقتی طور پر پیدا ہو جاتا ہے، یا جیسا کہ ملٹری بینڈ سننے سے خود بخود پاؤں میں ایک تحرک سا محسوس ہوتا ہے - لیکن ظاہر ہے کہ یہ سارا تأثر وقتی اور عارضی ہوتا ہے - یہ کبھی ساری زندگی کی رہنما طاقت نہیں بن سکتا[1] اور یہ ہمیشہ چند سفلی قوتوں کی بیداری اور بلند تر قوتوں کے تعطل پر مشتمل ہوتا ہے -

اسلام کا چونکہ مقصد بلند ہے اس لیے لازماً ذرائع بھی بلند ہیں - وہ اس قسم کے اوچھے ہتھیار استعمال نہیں کرتا جن سے انسان کی بعض قوتیں بلند تر قوتوں کو معطل کر کے بیدار کی جائیں وہ کبھی اپنی لڑائی ایک ایسے سپاہی سے نہیں لڑوانا چاہتا جو محض ملٹری بینڈ کی موسیقی سے کچھ کر بغیر سوچے سمجھے اُسکی صفوں میں شامل ہو گیا ہو - اسکے برعکس اسلام ایک نہایت مختلف قسم کا جذباتی

[1] چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ایسی اقوام میں دین اور دنیا، زندگی اور مذہب بالکل جداگانہ چیزیں ہوتی ہیں جنہیں ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا -

تأثر پیدا کرنا چاہتا ہے جو نہ صرف طبعاً بلند ہو بلکہ دائمی بھی ہو اور پوری زندگی میں کارفرما ہوسکے یہ جذباتی تأثر محبتِ الٰہی کے قرآنی تصور سے پیدا ہوتا ہے جسکی رو سے اللہ اور بندے کے درمیان محض حاکم و محکوم ہی کا رشتہ نہیں، بلکہ اس سے زیادہ قریبی (اور زیادہ پُر زور) رشتہ بھی موجود ہے۔ یہی جذباتی تأثر آپکو قرآن کے طرزِ تخاطب، اُسکی معنویت اور اُسکے اسلوبِ بیان سے ٹپکتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی چیز ایمان بالغیب کی بنیاد ہے۔ یہی آپکو اُس اندرونی اور وجدانی تحریک میں جلوہ فرما نظر آتی ہے جو انسان کو نماز کے اندر اپنے معبود کے سامنے سجدہ ریز کرتی ہے۔ یہی چیز آپکو رسولؐ اور صحابہؓ کے باہمی رابطہ کی سنہری زنجیر دکھائی دیتی ہے۔ حیدر، صدیق، فاروق ایمان کی اسی شمع کی ضیاء سے چمک رہے ہیں۔ ابوذر اور بلال کے سینے اسی نور سے منور ہیں۔

عشقِ رسول کی اہمیت یہ جذباتی عنصر کہیں بھی اس طرح نمایاں طور پر آشکارا نہیں ہوتا جس طرح کہ مسلمانوں اور اُنکے رسولؐ کے درمیانی تعلقات کی نوعیت میں۔ دنیا کی تاریخ آپکے سامنے ہے کسی تحریک کے لیڈر نے آج تک اپنے متبعین کے ساتھ مودّت و محبت کا ایسا استوار اور ناقابلِ شکست پیمان نہیں کیا جو رسولِ عربی نے پیروانِ دعوتِ اسلامی کے ساتھ کیا۔ اور کسی واحد انسان نے نوعِ انسانی کی مسلسل نسلوں سے متواتر، زمان و مکان کے لامحدود بُعد کے باوجود، کبھی اتنا خراجِ عقیدت و الفت وصول نہیں کیا جتنا کہ اس نبیِ اُمّی نے[1]۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، روسو، مارکس، یا نطشہ سے محبت کیے بغیر اُنکے فلسفۂ حیات کا اتباع کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ جب تک اس کے لیڈر سے آپکو انتہا درجہ کی محبت نہ ہو، آپ خواہ عقلی طور پر اس کی بنا کردہ تحریک کے قائل بھی ہو جائیں

---

[1] وہ آواز جو اشہد ان محمداً رسول اللہ کے الفاظ میں اذان کے اندر صبح و شام چوبیس گھنٹوں میں ہر وقت کرۂ ارض کے کسی نہ کسی حصہ میں، خطِ استواء کے جھلستے ہوئے گرم میدانوں سے لے کر ہمالہ کی برفانی چوٹیوں تک، کہیں نہ کہیں ہر لحظہ گونج رہی ہوتی ہے، "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" کی بہترین تفسیر ہے!

آپ صحیح معنوں میں مسلمان نہیں کہلا سکتے - چنانچہ ارشادِ نبوی ہے :

لا یومن احدکم حتی اکون | تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک
احب الیہ من والدہ وولدہ | کہ میں اس کو اسکے باپ اور بیٹے اور تمام انسانوں
والناس اجمعین - | سے زیادہ محبوب نہ ہوں -

کسی حد تک یہ ایک عجیب تقاضا ہے جو ایک عملی تحریک کا لیڈر اپنے ایک متبع سے کرتا ہے - اتباع، ڈسپلن، اطاعت، ہر ایک لیڈر اپنے متبع سے ان چیزوں کی توقع رکھے گا - لیکن محبت، اور اس نوعیت کی محبت ـــــ ! غالباً آج تک کسی ایک انسان نے باقیماندہ انسانیت سے کبھی یہ توقع نہیں رکھی تھی اور ایسا تقاضا نہیں کیا تھا ـــــ !

یوں تو ایک سوشلسٹ بھی ایک خاص نظریۂ حیات کا پیرو ہے اور ایک مسلمان بھی ایک خاص فلسفۂ زندگی کا متبع - وہ بھی ایک تحریک کا رکن ہے، اور یہ بھی - لیکن اِن دونوں میں ایک نہایت بنیادی فرق ہے - ایک نے اُس خاص نظریہ اور اسکے بانیوں کے ساتھ صرف عقلی بیعت کی ہے - اُسکے جذبات، اُسکی عقیدتیں، اُسکی محبتیں آزاد چھوڑ دی گئی ہیں کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنے لیے جو راہیں تلاش کرنا چاہیں کریں، جذباتی زندگی کی جو قدروں (Values) معین کرسکیں کرلیں - لیکن دوسرے نے اپنے نظریۂ حیات کو صرف عقلی طور پر ہی تسلیم نہیں کیا، بلکہ اُس نے اپنے ہادی کے ساتھ جذباتی بیعت بھی کی ہے - اسکے جذبات، اسکی عقیدتوں، اُسکی تمام محبتوں کے لیے پہلے ہی سے راہیں متعین ہیں - جسکا نتیجہ یہ ہے کہ اُسکی عقلی اور جذباتی قدور (Moral and emotional values) میں تضاد نہیں، اُسکے تمام نفسیاتی تقاضے اپنی اپنی جگہ پر مطمئن ہو رہے ہیں، اسکی پوری شخصیت کے تمام اجزا بغیر باہمی مخاصمت کے، انتہائی مطابقت (Harmony) کے ساتھ ایک ہی مقصد کے لیے ایک ہی راہ پر چل رہے ہیں ـــــ

غالباً اقبالؒ کے پیشِ نظر عقلی اور فوق العقلی قدور کا یہی غیر متصادم اختلاط تھا جب انہوں نے کہا:

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے

یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں!

"یہ نہایتِ اندیشہ" وہ عقلی وعلمی بصیرت ہے جسکے ذریعہ سے اسلام اپنی حقانیت تسلیم کرواتا ہے اور یہ "کمالِ جنوں" اُس روحانی وجذباتی جوشِ محبت کا نام ہے جو خدا اور رسولؐ کی ذات[1] سے وابستہ ہو کر اسلامی تحریک چلانے کے لیے پہلے فرد اور پھر جماعت کی تمام قوتوں کو مجتمع کرتا ہے۔ محبت ایمان وعمل دونوں کی پختہ ترین بنیاد ہے۔ اِسکے بغیر اتباعِ مکمل کا تصور ناممکن ہے۔ اِسکے بغیر انسان کے عملی قویٰ مستِ خواب ہیں۔ اسکے بغیر عقل وشعور گم کردہ راہ ہیں۔ بھٹکے ہوئے مسافر، نشانِ منزل سے محروم، اور دین؟ چند خاص نظریات کا ایک مجموعہ، مختلف نظامات کا ایک ڈھانچہ جسکے اندر آج تو انسان کی محدود اور ناقص عقل کو انسانیت کی فلاح نظر آرہی ہے لیکن ممکن ہے کل نظر نہ آئے۔

عقل و دل و نگاہ کا مُرشدِ اولیں ہے عشق

عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات!

عشق ہی سے ہر مقصد کو دوام ہے۔ عشق ہی سے ہر آئیڈیل (Ideal) کے اندر آمادۂ عمل کرنے کی آتشیں قوت ہے۔ یہ نہ ہو تو بلند سے بلند نصب العین آپ کے جمود کو نہیں توڑ سکتا۔ یہ ہو تو آپ اپنا سب کچھ لُٹا دینے کے بعد بھی یہی کہینگے۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

[1] ظاہر ہے کہ خدا اور رسولؐ کی محبت دراصل ایک ہی چیز ہے کیونکہ ایک بغیر دوسری کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔

اگر یہ ہو تو سینہ نورِ ہدایت سے منور ہے، زندگی میں ایک معنی موجود ہے۔ یہ نہ ہو تو حیاتِ ارضی ایک چکر ہے، لامتناہی و بے مقصود! یہی زندگی کی سب سے بڑی رہنما قوت (Guiding force) ہے یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ آدمی کے اندر ایک خاص جاذبیت، اُسکی شخصیت میں ایک خاص کشش پیدا ہوتی ہے اور اسکی طبیعت میں سے وہ ناقابلِ اظہار چیز جھلکنے لگتی ہے جسے "سوز" یا "روحانیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ "سوز" اور "روحانیت" جتنی ہی ناقابلِ بیان چیزیں ہیں اتنی ہی ناقابلِ انکار اور اہم۔

اسی سلسلہ میں مَیں بعض اور اصطلاحات کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جو بالخصوص اقبالؔ کی شاعری میں آپ کو جا بجا نظر آئینگی۔ مثلاً ذکر و فکر، عقل و دل، سوز و ساز، آہِ سحرگاہی، کلیمی و حکیمی، جمال و جلال، علم و عشق[1] وغیرہ۔ یقین جانیے یہ محض شاعرانہ ترکیبیں نہیں ہیں جو صرف حسنِ کلام کے لیے وضع کر لی گئی ہیں۔ بلکہ یہ اسلام کے مخصوص مزاج کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس میں عقلیات اور جذباتیات، طبیعیات اور روحانیات کا ایک دلچسپ امتزاج اور ایک خوبصورت توازن موجود ہے جہاں فکر کے ساتھ ساتھ ذکر موجود ہے اور حکیمی کے ساتھ کلیمی، اور علم کے ساتھ عشق

---

[1] انسان کی "ادراکی" اور "فوق الادراکی" کیفیتوں کے درمیان ایک واضح حدِ فاصل قائم کرنا نہایت مشکل ہے کیونکہ دراصل یہ کہا نہیں جاسکتا کہ آدمی کب اسکی سرحد پار کر کے اُسکی حدود میں داخل ہوا۔ اسی طرح "علم" اور "عشق" کے درمیان تضاد پیدا کرنا بھی غیر ضروری ہے۔ "ذکر" کو "فکر" کے خلاف صف آرا کرنا اور یہ سمجھنا کہ ایک دوسرے کے برعکس ہے، یہ بھی ایک غلطی ہے حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ فکر جو ذکر کی رفاقت اور رہنمائی سے محروم رہے، گمراہ کن ہے۔ اسی طرح وہی علم صحیح معنوں میں علم کہلائیگا جو عشق سے ہمکنار کرے۔

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہو جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم

عشق صحیح علم کے ارتقا کا فطری تقاضا ہے، ایک دوسرے کی ارتقائی شکل کا نام ہے۔ انکے درمیان تضاد و تخالف پیدا کرنا انسان کی پیچیدہ نفسیات کو جبری سادگی میں ڈھالنے کی کوشش (Over-simplification) ہوگی لیکن جو چیز یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ ان میں تضاد نہیں، لیکن یہ دو الگ الگ (distinct) کیفیتیں ہیں اور ایک بغیر دوسرے کے قابلِ اعتماد نہیں۔

اور ہر ایک بغیر دوسرے کے نامکمل ہے۔

آج کی ضرورت افکارِ پریشاں کے اس مجموعہ سے دو نتائج خاص طور پر مرتب ہوتے ہیں جو نہایت ہی اہم ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام محض ایک عقلی وعلمی نظام حیات نہیں اس میں "فوق الادراکی" عناصر بھی موجود ہیں۔ وہ انسان سے صرف عقلی بیعت ہی نہیں لیتا بلکہ اسکی جذباتی اور روحانی قوتوں کو بھی عمل میں لاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ بغیر اُس جذباتی عنصر کے جو ایمان کا ایک ضروری جزو ہے ایمان کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ دین کی صداقت کو صرف عقلی طور پر تسلیم کر لینا ہی کافی نہیں۔

آج آپ چاروں طرف نظر دوڑائیں، ایک طرف آپکو اربابِ تصوف نظر آئینگے جن میں علمی تفکر کا فقدان مضحکہ خیزی کی حد تک ہوگا۔ دوسری طرف علماء کا طبقہ ہے جس میں آپ روحانیت اور سوز کے ایک ذرہ تک کو ترسینگے، جنکے اندر آپکو ایک خاص قسم کی برودت، جمود، اور یبوست نظر آئے گی، جن میں اُس جذباتی عنصر کی افسوسناک کمی ہوگی جو اسلام کے مقتضیات میں سے ہے۔ ہر سمت اسی افراط و تفریط سے آپ دوچار ہونگے۔ کہیں آپکو وہ جامعیت نظر نہ آسکے گی جو صحابۂ کرام کا طغرائے امتیاز ہے۔ آج اس امر کی ضرورت ہے کہ جہاں اسلام کے مکمل نظام کی تدوین کی جا رہی ہے، اُسکے فلسفۂ اخلاق و اقتصادیات و سیاسیات مرتب کیے جا رہے ہیں، وہاں اِس حقیقت کو فراموش نہ کیا جائے کہ اسلام کے احیاء کے لیے یہ سب کچھ انتہائی ضروری ہے، مگر صرف یہی کافی نہیں۔ پیشتر اسکے کہ جماعت کی مجموعی قوتیں تحریک چلانے پر مرکوز ہو سکیں افراد کی تمام انفرادی قوتیں بیدار اور مجتمع کرنا ضروری ہے۔ اور یہ صرف اس طرح ممکن ہے کہ آپ افراد کی عقل کو مطیع کرنے کے ساتھ ہی انکے اندر اس قسم کے جذباتی اور روحانی عناصر کی نشوونما کو بھی پوری اہمیت دیں جو آپکو صحابۂ کرام کی زندگی کی سب سے بڑی قوت متحرکہ نظر آتے ہیں، اور اسلامی تاریخ کے ابتدائی صفحات جنکی کارفرمائیوں کے آئینہ دار ہیں ــــــ!

فریضۂ جہاد

(از جناب مولانا سید فضل اللہ صاحب استاذ تفسیر جامعہ عثمانیہ)

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا -

"اس شخص کے لیے بیشک اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ (عمل) ہے جو اللہ سے اور قیامت کے دن سے امید رکھتا ہے - اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہے"

اللہ تعالیٰ اپنے دین کو باقی رکھے گا - لیکن سوال آپ سے ہے کہ آپ اس سعادت میں کیا حصہ لے رہے ہیں؟ آج دنیا کے چپہ چپہ پر اسلامی تعلیم پہنچ گئی ہے - اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو چکی ہے - اب کوئی قوم یہ نہیں کہہ سکتی کہ ہم اسلام سے ناواقف رہے - خدا کی آواز ہم کو نہیں پہنچ سکی - اسکے سمجھنے کے سامان سے ہم محروم تھے - آپ تبلائیں کہ اس سعی میں آپکا کیا حصہ ہے؟

حکومتوں نے اپنی سیاسی مصلحتوں سے، تاجروں نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے، ماہر نفسیات نے اپنا علم مکمل کرنے کی غرض سے، دوسرے فن والوں نے اپنی فنی ضرورتوں کے نقطۂ نظر سے، نام آوروں نے اپنی شہرت کے لیے، فاضلوں نے اپنے فضل و کمال کا سکہ جمانے کے لیے اور نہ معلوم کن کن لوگوں نے کس کس نیت سے اور کس کس مقصد کو پیش نظر رکھ کر اللہ کا دین نہیں بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین سمجھ کر اس دین (قرآن و حدیث) کی، اس دین کی زبانوں (عربی، فارسی، اردو) کی خدمت انجام دی ہے - تو کیا اس سے تبلیغ کا فرض آپ کے سر سے اتر گیا؟

پندرہ روپوں میں دین کا پورا نصاب (کورس) اپنی زبان میں آپکو مل سکتا ہے تو فرمایئے "بلغوا عنی ولو آیۃ" کی تعمیل میں کتنی خدا کی باتیں دوسروں کو آپ نے بتلائی ہیں؟ خدا نے بولنے کی طاقت دی ہے، آپ اپنی زبان گنگ کر لیتے ہیں - ضرورت کے وقت زبان کھولنے کو فتنہ بتلاتے ہیں "الساکت عن الحق" بنے رہتے ہیں - لوگوں کو اللہ کی ہدایت نہ پہنچا کر بھٹکنے دیتے ہیں - دنیا میں اللہ کی نافرمانی بڑھتی جا رہی ہے - اسکے بندے گناہوں پر جری ہو رہے ہیں - آپ انہیں اللہ کا حکم نہیں بتاتے - پھر سوچیے کہ شیطان کا مقصد آپ کس آسانی سے پورا کر رہے ہیں آپ مامور تھے کہ:

من رای منکم منکراً	تم میں سے جو کوئی ناروا بات دیکھے تو اپنے
فلیغیرہ بیدہ	ہاتھ سے اسکو بدل دے -

آپ ہاتھ سے تو کیا زبان سے بھی کام نہیں لیتے - اپنی ذمہ داریوں کو بالکل بھول چکے ہیں - آپ سے کہا گیا تھا -

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس	تم بہترین امت ہو لوگوں کے لیے مبعوث کیے
تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر	گئے ہو اچھی باتوں کا حکم دیتے ہو - برائیوں سے روکتے
وتؤمنون باللہ (آل عمران)	ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو -

فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے ایک قوم کی اصلاح کے لیے ایک ایک نبی بھیجا جاتا تھا - اب سارے عالم کے لیے امت محمدیہ مبعوث ہوئی ہے اور اسکے یہ تین فرائض یہاں گنائے گئے ہیں (۱) اچھی باتوں کا حکم دینا (۲) برائیوں سے روکنا (۳) اللہ پر ایمان رکھنا - ان تین فرائض کو پورا کرنے کے بعد ہی ہم خیر امت کے لقب کے مستحق ہیں - اگر ان باتوں سے ہم کنارہ کش ہو رہے ہیں تو پھر اس عزت کے لقب سے بھی ہم کو ہاتھ دھونا پڑیگا - اس امت کے ہر فرد کا یہ فریضہ ہے - اب اگر ہر فرد

اس فرض کو انجام نہیں دیتا تو امت اسلامیہ میں ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو اس فرض کو انجام دے۔

ولتکن منکم امۃ یدعون — تم میں ایک جماعت ایسی ہو جو خیر کی طرف بلائے
الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون — اور نیکی کا حکم دے اور برائیوں سے روکے
عن المنکر واولئک ھم المفلحون (آل عمران) — یہی لوگ کامیاب ہیں۔

مگر یاد رکھیے کہ کامیابی صرف اسی مبلغ جماعت کے لیے مخصوص ہے۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم کی اصل فضیلت کیا یہ نہیں ہے کہ وہ اس دین کے معمار بنے؟ دین کو دوسروں تک پہنچانے میں انھوں نے اپنے جان و مال، وقت، دل، دماغ کو بے دھڑک خرچ کیا اور زندگی کے ہر لمحے کو وقفِ عمل رکھا۔ اگر آپ بھی اس نصرت خداوندی کے منتظر و آرزومند ہیں جو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حاصل ہوئی تھی، تو اس کا ذریعہ صرف یہ ہے ولینصرن اللہ من ینصرہ (الحج) "اللہ ضرور مدد کریگا اسکی جو اللہ کی مدد کرتا ہے"۔ یا ایھا الذین اٰمنوا ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم (محمد) "اے ایمان والو اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کریگا اور تمہارے قدم جما دیگا"۔ آپ جانتے ہیں کہ نصرت نام ہے اسکا کہ جسکی آپ مدد کرنا چاہیں اسکی مرضی کے مطابق اپنی دولت فرصت و طاقت کا استعمال کریں اور اسکے بنائے ہوئے مقصد کے لیے آپکی ساری جدوجہد ہو۔ جب آپ اللہ کے پیغام کے پہنچانے اور منوانے میں اپنی پوری جدوجہد کرینگے اور اللہ کی مرضی کے مطابق اپنی طاقت و فرصت کا استعمال کرینگے تو اللہ تعالیٰ بھی آپ کی مدد کریگا اور آپ کی آرزوؤں کو پورا فرمائیگا۔ پھر غیر ممکن ہے کہ اللہ کی رحمت کی بارش آپ پر ہو اور آپ دونوں جہاں میں سرسبز و شادکام نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے احکام کے جاری کرنے پر بشارت دیتا ہے:

ولو انهم اقاموا التوریٰة	اگر وہ قائم کرتے توریت و انجیل اور اس
والانجیل وما انزل الیهم من	چیز کو جو ان کے رب کی طرف سے ان پر اتاری گئی ہے
ربهم لاكلوا من فوقهم ومن	تو کھاتے اپنے اوپر سے اور پاؤں کے
تحت ارجلهم (مائدہ)	نیچے سے۔

جہاد اللہ کا پیغام پہنچانے اور اس کو منوانے کی سعی و کوشش کا نام ہے۔ اگر اس راستے میں روپیہ پیسہ حتی کہ جان بھی چلی جائے تو یقین کیجیے کہ اسی دن کے لیے آپ کے پاس امانت تھی "ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اهلها" کے حکم کی تعمیل میں یہ سب دے کر آپ ہر امانت سے سبکدوش ہوتے ہیں تو صرف یہی نہیں کہ حور و قصور ہی آپکا خیر مقدم کرینگی بلکہ دنیا کی عزت، دولت اور حکومت بھی آپکے قدم چومیگی۔ اگر آخری نتیجہ آپکو اس وقت نظر نہیں آتا پروا نہ کیجیے۔ اللہ کا حکم ہے اس وجہ سے اور صرف اسی وجہ سے جہاد کے سب سے پہلے زینہ یعنی "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی تبلیغ کے لیے قدم بڑھائیے۔ اسکے اقرار کے بعد آپ اچھی باتوں کا حکم دنیا اور بری باتوں سے روکنا شروع کر دیجیے۔ آپکا ہر عمل نئے عمل کا راستہ کھولیگا۔ آپ یقین رکھیے کہ "والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا" "جنھوں نے محنت کی ہماری راہ میں ہم کھول دینگے ان پر اپنی راہیں"۔ اپنی جد و جہد اس وقت تک جاری رکھیے کہ اللہ کا حکم شرعی جاری ہونے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ وقاتلوهم حتی لا تكون فتنة ويكون الدين كله لله پر آکر ہمارا فریضۂ جہاد ختم ہو کر دوسرے مجاہدہ کا دروازہ کھلتا ہے جس طرح ہماری یہ جد و جہد اور جانی و مالی قربانی ہمارے سب گناہوں کو دھو ڈالتی ہے اور جنت کا وارث بناتی ہے اسی طرح ہماری یہ سعی پیہم اور لگاتار عمل تخت و تاج کا مالک بھی بناتی ہے۔ بشارت سے پہلے ہمکو اشارہ کر دیا گیا ہے "واخری تحبونها"، وہ دوسری تمہاری چہیتی چیز جسکو تم بہت

دور کی سمجھ رہے ہو۔ نصر من اللہ وفتح قریب، اللہ کی مدد اور فتح قریب ہے۔ تمہاری طرف سے صرف تومنون باللہ ورسولہ وتجاھدون باموالکم وانفسکم کی ضرورت ہے۔ ثمرہ کام کے ختم پر ملتا ہے۔ کام انتہا پر اسی وقت پہنچیگا جبکہ آپ اسکو شروع کریں۔ آپ شروع تو کرتے نہیں۔ دقتیں پیش کرتے ہیں۔ عنوان کی آیت کو دیکھیے کہ ہر کام میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ ہمارے لیے مشعل ہدایت ہے۔ دینِ حق کا قیام حضور کا اصل کام تھا۔ اس کام کے اُتار چڑھاؤ کا آپکی زندگی میں اور آپکی تعلیم میں ملنا ضروری ہے۔ کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کا پیغام سنانے میں ہر قسم کی مصیبتیں نہیں سہیں؟ ہر طرح کی ذلتیں نہیں برداشت کیں؟ ہر کٹھن وادی میں نہیں اُترے؟ بالکل سچ ارشاد ہے کہ "جس قدر مجھکو اذیت دی گئی اتنا کوئی اور نہ ستایا جائیگا" (مشکوٰۃ باب الفقراء)۔ تو جب آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کام لیکر اُٹھتے ہیں تو یہ پریشانیاں اور ذلتیں آپ کے لیے حوصلہ شکن نہیں ہوسکتیں۔ آپکو تو مزہ آنا چاہیے کہ یہ وہ حالات ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر گذر چکے ہیں۔ ہاں! غیروں کے شور و شغب نے ہمارے ایمانی جذبات کو فنا کردیا ہے۔ ہمکو خود اپنے سے مایوسی ہو رہی ہے۔ مگر ایسے حالات میں تو اور زیادہ استقلال و ہمت کی ضرورت ہے۔

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی حدی را تیز ترمیخواں چو محمل راگراں بینی

اس کام میں بڑی احتیاط اس بات کی رہے کہ دل و دماغ میں دولت وجاہ کی طلب بالکل نہ آنے پائے۔ یہ عبادت ہے اور سب سے بڑی عبادت۔ اور عبادت میں حکم ہے لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین۔ اِس طرح اللہ کا حکم بجا لاکر اس کا قرب حاصل کرتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنے سے اللہ کے پیارے بنتے ہیں۔

اس کے سوا کچھ مقصد نہیں - اور اگر آپکا اسکے سوا کچھ مقصد نہیں کہ اللہ خوش ہو اور اسکا کلمہ بلند ہو تو آپکی یہ سعی جہاد فی سبیل اللہ ہے - ورنہ اللہ سے کسی ثواب نتیجہ کی امید نہ رکھیے - آپ خیال کرتے ہیں کہ جگہ جگہ مدرسے ہیں - انجمنیں ہیں - رسالے ہیں - کتابیں ہیں - اخبار ہیں - تقریریں ہیں جلسے ہیں اور یہ سب کام تو ہو رہے ہیں - میں بھی کہتا ہوں کہ یہ سب باتیں جاری ہیں اور ان میں ترقی ہو - لیکن انکا ناکافی ہونا تو آپ خود بھی جانتے ہیں اور اس تلخ حقیقت کو بھی کہ ان میں سے کوئی چیز بھی ہمارے زمانہ میں دین سے لگاؤ پیدا نہیں کر رہی ہے - تو پھر شوق و رغبت کیسے پیدا ہو؟ اور جب شوق و رغبت نہیں تو ان اداروں سے فائدہ حاصل ہونا غیر ممکن ہی ہوتا جا رہا ہے - سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے الٰہ ہونیکا مفہوم اپنے دل و دماغ میں واضح طور سے نقش کر لیجیے تو جڑ مضبوط ہو جائیگی اور جب جڑ مضبوط ہو گی تو ساری شاخیں اور ٹہنیاں پھل پھول دینے لگینگی - صحابہ کی زندگی آپکے سامنے ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں جس طرح انہوں نے کام کیا تھا آپ بھی کیجیے - اس میں جسقدر آپکی نیت امتثال امر الٰہی و اتباع سنت کی ہوگی اسی قدر اسکا اجر ہوگا - جس قدر جو طریقہ دین کی خدمت کا نبوت کے طریقہ سے قریب ہوگا اسی قدر اسکے آثار نمایاں ہونگے - اور جو بالکل سنت کے مطابق ہو اسکے انوار کا کیا کہنا -

آپ کہتے ہیں کہ روح اسلامی ضعیف و سرد ہو چکی ہے اور ایمانی قوتیں مضمحل ہوتی جا رہی ہیں - اچھا تو پھر اس روح پھونکنے کا وہی طریقہ اختیار کیجیے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا تھا۔ "لن یصلح امر ھذہ الامۃ الا بما صلح اولھا" پہلی مرتبہ بھی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے اسلام نے زندگی حاصل کی تھی - اب بھی وہ اس سے دوبارہ زندگی حاصل کر سکتا ہے اور کریگا - یہ انسان کا ایک فطری مطالبہ ہے کہ کسی کے سامنے سر جھکائے - اور اگر اسکی فطرت مردہ نہیں ہوئی ہے اور نہ غلط راستہ پر پڑی ہے تو پھر وہ ایک ہی کے سامنے سر جھکانا چاہتا ہے ـــــ دل و زبان سے اللہ کے رسول

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلائی ہوئی بات لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیجیے اور نماز پڑھ کر اسکا ثبوت دیجیے کہ ایاك نعبد وایاك نستعین - جو طبقہ اصلاح سے مایوس ہے وہ صرف اسی کلمہ کی تبلیغ وتفہیم کے بعد دیکھے کہ حالات میں خوشگوار انقلاب ہوتا ہے یا نہیں - جس طرح نماز، حج، زکوٰۃ میں اپنی حالت پر نظر نہیں ہوتی صرف تعمیل حکم کا ارادہ ہوتا ہے اسی طرح تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں بھی صرف حکم کی بجاآوری ہمارا مقصد ہونا چاہیے - اس کام کو انجام دینے کے لیے یہ شرط نہ لگائیے کہ آپکی تبلیغ بارآور بھی ہو - انك لا تهدی من احببت "جسکو آپ چاہیں آپ اسکو ہدایت نہیں پہنچا سکتے" اور ہم اپنے کو تبلیغ و امر بالمعروف کا نااہل سمجھیں اس سے بھی ہمیں روکا گیا ہے - یہاں جھوٹے انکسار کا کچھ کام نہیں -

عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یحقرن احدکم نفسہ قالوا یا رسول اللہ کیف یحقر احدنا نفسہ قال یری امر اللہ علیہ مقال ثم لا یقول فیہ فیقول اللہ عز وجل یوم القیٰمۃ ما منعك ان تقول کذا وکذا؟ فیقول خشیۃ الناس - فیقول فایای کنت احق ان تخشی (ترغیب کتاب الحدود ص۳۳۴)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے حضرت رسول اکرم کا ارشاد بیان کیا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے کو حقیر نہ خیال کرے - صحابہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ ہم میں سے کوئی اپنے آپ کو حقیر و ذلیل کیسے سمجھے گا؟ ارشاد ہوا کہ اللہ کے احکام کو وہ دیکھتا ہے کہ اس میں کہنے کا موقع ہے پھر نہیں کہتا - قیامت میں اللہ تعالیٰ اس سے پوچھیگا کہ فلاں فلاں معاملات میں ہدایت کرنے سے تجھکو کس امر نے روکا تھا - یہ جواب دیگا لوگوں کا ڈر تھا - اس عذر پر ارشاد خداوندی ہوگا کہ میں زیادہ اسکا مستحق تھا کہ تو مجھ سے ڈرتا -

عن انس قال قلنا یا رسول اللہ لا نامر بالمعروف حتی نعمل بہ کلہ ولا ننهی عن

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم اس وقت تک لوگوں سے اچھے

المنکر حتی نجتنبه کله فقال صلی الله علیه وسلم بل مروا بالمعروف وان لم تعملوا به کله - وانهوا عن المنکر وان لم تجتنبوه کله (ترغیب کتاب الحدود)

کاموں کے لیے نہ کہیں گے جب تک کہ خود تمام اچھے کاموں پر ہمارا عمل نہ ہو اور ہم دوسروں کو برائیوں سے نہ روکینگے جبتک کہ ہم خود ان سے پوری طرح رک نہ جائیں۔ ارشاد ہوا کہ اچھی باتوں کا لوگوں کو حکم کرتے رہو اگرچہ تمام باتوں پر تمہارا عمل نہ ہو اور بری باتوں سے لوگوں کو روکتے رہو اگرچہ تم ساری برائیوں سے بچے ہوئے نہ ہو۔

آپ خیال کرتے ہیں کہ آپکا شریعت کی بہت سی باتوں پر عمل نہیں ہے تو دوسروں کو کس طرح ہم کہیں - میں عرض کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے نہ بے عمل کو نصیحت سے روکا ہے اور نہ اسکی نصیحت کرنے کو گناہ قرار دیا ہے - یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ دوسروں کو نصیحت کرنا اور اپنے آپ کو بھول جانا بھی صحیح نہیں

اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم وانتم تتلون الکتاب افلا تعقلون -

تم لوگوں کو تو اچھی باتیں بتلاتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ کیا تم نہیں سمجھتے!۔

لیکن دوسری طرف یہ بھی تو سوچیے اگر شریعت کی کچھ باتوں پر آپ کا عمل نہیں ہے اور پھر تبلیغ کے اہم فرض کو بھی آپ چھوڑ دیں تو آپکی بے عملی اور بھی بڑھ جائیگی۔

جو بات اس امت محمدیہ کے ہر فرد کے ذمہ تھی اگر اسکو ہم صرف علماء سے مخصوص سمجھ لیں تو یہ ہماری بڑی غلطی ہے - جو بھی اپنے فرض سے غافل ہے اسکو جوابدہی کرنی ہوگی -

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته -

تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور اپنی رعیت کے متعلق (اللہ کے پاس) جوابدہ ہوگا-

”زیادہ سے زیادہ علماء کا کام راستہ دکھلانا اور حق بتلا دینا ہے - اس پر چلنا اور چلانا یہ تو دوسروں کے ذمہ ہے“ (اسباب زوال امت از علامہ شکیب ارسلان)

"پہلے اپنے نفس کی اصلاح ضروری ہے" کہکر شیطان آپکو اس اہم فرض سے روکتا ہے اور آپکے نفس کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیتا ہے۔ حالانکہ اگر آپ اللہ کا یہ فرض انجام دینا شروع کر دیں تو آپکے ایمان کی خامی نہ صرف دور ہوتی جائیگی بلکہ بڑی ریاضتوں اور اصلاح نفس سے برسوں میں جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ اس مجاہدہ سے دنوں میں حاصل ہوگا۔ اگر ہر شخص علیکم انفسکم کے منشا کے مطابق اپنا فرض انجام دینے میں لگ جائے تو یقیناً پوری امت کی اصلاح ہو جائے ہر شخص اپنے شخصی فرائض کو پوری طرح ادا کرے۔ ایک گھر کا رکن ہے، اسکی وجہ سے اسکی ذات پر جو ذمہ داری ہے اس پر اسکی نگاہ اور اسکے مطابق عمل ہو۔ پھر وہ ایک خاندان کا رکن ہے، اسکے لحاظ سے اسکی ذات پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں انکو نہ چھوڑے۔ پھر وہ ایک محلہ میں رہتا ہے ایک پیشہ میں ہے، ایک جماعت (سوسائٹی) میں ہے، ایک شہر میں ہے ایک حصۂ ملک میں ہے، ایک ملک میں ہے، ایک حکومت میں ہے، اور دنیا میں ہے، ہر ایک لحاظ سے اسکی ذات پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ انکو پورا کرے تو بے شک کسی کی گمراہی اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتی۔ بشرطیکہ ہدایت کا سر رشتہ ان تمام مواقع میں اسکے ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم۔ اپنی اصلاح اور اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے میں دوسروں کا منہ تکتے رہو، اسکی گنجائش اس آیت میں بالکل نہیں۔ اور اگر آپ قرآن کے معنی سمجھنے میں قرآن جس پر نازل ہوا ہے اسکی تفسیر کو سامنے رکھیں تو اس سے معلوم ہو جائیگا کہ اس آیت کی تفسیر میں دراصل امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم دے رہے ہیں۔

عن ابی ثعلبۃ الخشنی فی قولہ تعالیٰ	حضرت ابو ثعلبہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم
علیکم انفسکم فقال اما واللہ لقد	صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا صرف اپنے
سئلت عنھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ	نفس کی نگہداشت واجب ہے تو ارشاد ہوا۔ بلکہ

وسلم فقال بل ائتمروا بالمعروف اچھے کاموں کے لیے ایک دوسرے سے کہو وتناھوا عن المنکر ۔ اور بری باتوں سے ایک دوسرے کو روکو۔

آپ سے کہا گیا ہے کہ لا یستوی القاعدون من المومنین غیر اولی الضرر والمجاھدون فی سبیل اللہ، یعنی فرض ادا کرنے والے اور فرض سے غفلت برتنے والے برابر نہیں ہو سکتے۔

اگر نتیجہ آپکی سمجھ یا نظر میں نہیں آتا نہ سہی۔ ان سعیہ سوف یری پر تو ایمان ہے زندگی کے کسی دور میں اس کا ثمرہ نیت کے مطابق ہم کو ضرور ملیگا۔ اور وہ وقت اس سے تمتع کے لیے بہتر ہوگا۔ لا اضیع عمل عامل منکم کے وعدہ کے بعد کسی خسارے کا اندیشہ نہیں نتائج کیا مرتب ہونگے؟ اسکو آپ نہ سوچیے اللہ اور اسکے رسول سے معلوم کیجیے۔ بندہ کا کام بندگی یعنی اپنے فرائض پر نظر رکھنا ہے کہ کون کون فرض ادا ہوگیا اور کیا باقی ہے؟

آپ نے اپنی ترقی وعزت کا ذریعہ تجارت، زراعت، صنعت، حرفت، نظم و اتفاق نہ معلوم کن کن چیزوں کو سمجھ رکھا ہے۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے جب کسی بات کو اپنی ترقی وعروج کا مستقل سبب قرار دیا اور درمیان میں اللہ کو نہیں لائے تو اللہ تعالیٰ نے اسی کو انکی ذلت و نکبت کا سبب بنا دیا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ یورپ کے علوم وفنون اور انکا طریقہ تعلیم تم کو ہر قسم کی سربلندی وعزت بخشے گا اور تمہارے کھوئے ہوئے وقار کو واپس لائیگا۔ مگر قومی نقطۂ نظر سے دیکھیے کہ اسی تعلیم نے ان کے وقار وعزت کو خاک میں ملا دیا اور اس راستہ سے انکی رہی سہی خوبیاں بھی ختم ہوگئیں۔ درانحالیکہ اسی تعلیم سے غیر مسلم نے ہر قسم کی ترقی کی۔ اسلام کی عبادت، معاشرت، تمدن، سیاست وحکومت کے اصول جس قدر پاکیزہ، سادہ، سہل، پرحکمت، بلند پایہ، نتیجہ خیز، نفع بخش، اور محیط ہیں، دنیا کو اس کا اعتراف ہے، مگر ہمارا جدید تعلیم یافتہ آدمی نہ صرف

ان سے ناواقف ہے بلکہ ان پر نکتہ چینی اسکا دلچسپ مشغلہ ہے۔ اس پر بر آئے زنی اسکی روشن دماغی کا ثبوت ہے اور غیر مسلموں کے سامنے ان چیزوں کی تحقیر کو وہ رواداری کے لیے ضروری جانتا ہے۔ اسکا نتیجہ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے قومی مفاد کو غیروں کے ادنیٰ سے اشارہ پر ٹھکرا دیتا ہے اور اپنے مذہب کے احکام کی پائمالی کا اسکو بالکل احساس تک نہیں ہوتا۔ بخلاف اس کے اسلام کے علاوہ دوسرے طریقے جن میں تنگ نظری، دشواری، گندگی، خلاف فطری اور عقل میں نہ آنے والی باتوں کی کمی نہیں ہے، اُنکے پیرووں میں اسی تعلیم کا یہ اثر آپ دیکھینگے کہ وہ نہ صرف اپنے مذہب سے لپٹ کر رہنا چاہتے ہیں بلکہ اسکے حامی و داعی بھی ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ بہت سے حل طلب سوالات کے جواب سے انکا مذہب قاصر ہے اور انسانی زندگی کی ضرورتوں کے لیے ان کے مذہب کی ہدایتیں ناکافی ہیں۔ غیر مسلم اس تعلیم سے اس قدر کفایت شعار بن جاتا ہے کہ اسی تعلیمی ماحول میں مدتوں گذار کر بھی وہ اس سے بالکل نہیں شرماتا کہ سنجیدہ صحبتوں اور مذہبی اجتماعوں میں جسم کے جس حصہ کو کہیں بھی ننگا نہیں کیا جاتا اسکو بھی ننگا کر کے اپنی انتہائی کفایت شعاری کا ثبوت دے۔ مگر وہ مسلمان جسکو بتلایا گیا تھا کہ بے ضرورت خرچ شیطانی کام اور خدا کی ناشکری ہے، اسی تعلیم کے طفیل میں اپنے باپ دادا کے شاہی زمانے کی فضول خرچیوں کو بھی مات کر دیتا ہے۔ غیر مسلم اسی تعلیم سے ہر اس رسم و رواج بلکہ ایسی مذہبی رسموں کا بھی دشمن بن جاتا ہے جن سے اسکی قوم تباہ ہوتی ہو، مگر مسلمان اسی تعلیم کے بعد تباہ کن رسوم و عادات کی پیروی میں اپنے اگلوں کو بھی مات کر دیتا ہے۔

ان سے کہا گیا کہ تجارت تمہاری دولت میں ترقی دے گی، تمہاری عزت بڑھ جائیگی، تمہاری باتوں کا وزن ہوگا۔ بینک کا نظام تمہارے ہاتھوں میں ہو تو تمہاری فلاکت اور سارا افلاس دھل جائیگا۔ لیکن اس راہ میں بھی جتنی تگ و دو کی اسکا کچھ نتیجہ نہ نکلا بلکہ ایک دھاک جو قائم

تھی وہ بھی جاتی رہی - بخلاف اسکے غیر مسلموں نے اس راہ میں جو ترقی کی ہے وہ آپکے سامنے ہے - زراعت میں مسلمانوں کی زمینیں انکے ہاتھوں سے نکلتی جارہی ہیں اور دوسری زراعت پیشہ قوموں کا زمین پر قبضہ بڑھتا جارہا ہے - صنعت و حرفت کے میدان میں بھی نتائج کچھ امید افزا نہیں - کیا اسکے بعد بھی آپ یہ نہ سمجھینگے کہ خدا سے منہ موڑ کر مسلمان جدھر بھی جائینگے ٹھوکر ہی کھائینگے۔

آپ کہتے ہیں کہ ہم اس وقت بڑے مایوس کن ماحول میں ہیں - مگر ذرا تو سوچیے کہ کیا آپ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی زیادہ مایوس کن ماحول میں ہیں؟ ایمان کی وجہ سے آپنے کبھی پتھر کھائے؟ ایمان کی وجہ سے کبھی آپکی ناک میں دھونی دی گئی؟ صحابہ کے ان مصائب اور پریشانیوں کو آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں - ان کو کیوں دہراؤں - البتہ یہ ضرور کہونگا کہ اگر آپ مایوس کن ماحول میں ہیں تو ایسے ماحول میں اور زیادہ ہمت اور عزم سے کام لینے کی ضرورت ہے ورنہ ہمت ہارنے کے نتائج اور بھی زیادہ مایوس کن ہونگے -

اس قدر اہم، نتیجہ خیز اور انقلاب انگیز فریضہ کو پسِ پشت ڈالنے کے لیے ایک عجیب و غریب عذر قربِ قیامت کا پیش کیا جاتا ہے - حالانکہ قرآن و حدیث میں قربِ قیامت کے عذر کی بنا پر اس فرض کے چھوڑنے کی اجازت کا مجھکو کہیں پتہ نہیں چلا - خصوصاً علماء کو تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بخوبی واقف ہونا چاہیے -

سیکون فی اٰخر ھذہ الامۃ	اس امت کے آخر میں ایک گروہ ہوگا جو صحابہ جیسا
قوم لھم مثل اجر ھم یامرون	اجر حاصل کریگا - وہ امر بالمعروف کریگا اور برائیوں
بالمعروف وینھون عن المنکر و	سے روکے گا - اور فتنہ پردازوں سے
یقاتلون اھل الفتن (مشکوٰۃ)	جنگ کرے گا -

اگر قیامت کے قریب ہونے کا علم آپ کو ہے تو پھر اس وقت سے بڑھکر کون سا موقع ہوگا

کہ آپ صحابہ کے درجوں کو حاصل کرلیں بلکہ اجر خمسین منکم۔

مثل امتی کالمطر لا یدری	میری امت کی مثال بارش کی سی ہے پتہ نہیں
اولہ خیر ام آخرہ	کہ پہلی بارش بہتر ثابت ہوگی یا آخر۔

ان مواقع کو کھو دینا خصوصاً علم رکھنے والوں کے لیے تو کسی دانشمندی کی علامت نہیں ہے۔

قرآن نے ہمکو بتلایا ہے کہ ایک جماعت نے سابقین بالخیرات سے ایسی ہی مایوس کن حالت میں کہا تھا:

لِمَ تَعِظُونَ قَوماً نِ اللہُ مُھلِکُھُم	تم ایسی قوم کو کیوں نصیحت کرتے ہو جبکو
اَو مُعَذِّبُھُم عَذَاباً شَدِیداً۔	اللہ ہلاک کرنیوالا ہے یا سخت عذاب دینے والا ہے؟

انہوں نے جواب دیا:-

قَالُوا مَعذِرَۃً اِلٰی رَبِّکُم وَ	اس لیے کہ اپنے رب کے سامنے خود اپنی
لَعَلَّھُم یَتَّقُونَ۔	ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں اور اسلیے کہ شائد یہ لوگ خدا سے ڈریں۔
فانجینا الذین ینھون عن السوء	جو لوگ برائیوں سے روکتے تھے انکو تو ہم نے
واخذنا الذین ظلموا بعذاب بئیس۔	بچا لیا اور باقی ظالموں کو سخت عذاب میں پکڑ لیا۔

پس اگر ہم نجات چاہتے ہیں تو ہم پر دعوت الی الخیر اور امر معروف و نہی عن المنکر لازم ہے جو لوگ ظالم بستیوں میں اللہ کے باغیوں کے ساتھ رہیں اور اصلاح کی کوشش نہ کریں ان کے حق میں قرآن کا فیصلہ یہ ہے:

لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل	بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر داؤد اور
علی لسان داؤد وعیسی ابن مریم	عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی۔ یہ اس لیے
ذلک بما عصوا وکانوا یعتدون۔	ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گذرتے تھے۔
کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ	وہ ایک دوسرے کو برے کاموں سے روکتے نہ تھے

ولبئس ماکانوا یصنعون۔

اور یہ بہت برا تھا جو وہ کرتے تھے۔

کس قدر ڈرنے کی بات ہے کہ اس فرض کے چھوڑ دینے سے ہم کلمہ گوئی کے نفع سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تزال لا الہ الا اللہ تنفع من قالہا وترد عنہم العذاب والنقمۃ مالم یستخفوا بحقہا قالوا وما الاستخفاف بحقہا قال یظہر العمل بمعاصی اللہ فلا ینکر ولا یغیر (ترغیب)

حضرت انس سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا الہ الا اللہ اپنے قائل کو نفع پہنچاتا رہیگا اور عذاب و مصیبت کو ہٹاتا رہیگا جب تک لوگ اسکے حق کی ناقدری نہ کریں۔ حاضرین نے دریافت کیا کہ اسکے حق کی ناقدری کیا ہے؟ فرمایا اسکی ناقدری یہ ہے کہ اللہ کی نافرمانی کھلم کھلا ہونے لگے اور پھر بھی نہ تو اس پر انکار کیا جائے اور نہ اس حالت کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔

اس تبلیغ کو چھوڑنا ہر قسم کی ذلت، نکبت اور پریشانیوں کو دعوت دینا ہے۔

عن حذیفۃ مرفوعاً قال والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف ولتنہون عن المنکر او لیوشکن اللہ یبعث علیکم عقاباً عنہ تدعونہ فلا یستجیب لکم (ترغیب)

حضرت حذیفہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بیان کرتے ہیں کہ تم پر نیک کاموں کے لیے کہتے رہنا اور بری باتوں سے روکتے رہنا ضروری ہے۔ ورنہ قریب سمجھو کہ اللہ تم پر عذاب مسلط کرے گا۔ پھر دعا کرو گے تو تمہاری دعائیں قبول نہ کریگا۔

عن ابی بکر الصدیق انی سمعت رسول اللہ یقول ان القوم اذا رأوا المنکر فلم یغیروہ عمہم اللہ بعقاب (مشکوٰۃ)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ کوئی قوم جب ناروا باتوں کو دیکھ کر ان کو بدل نہیں دیتی تو اللہ تعالیٰ اس پر عذاب عام بھیجتا ہے۔

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا ایہا الناس مروا بالمعروف وانہوا عن المنکر قبل ان تدعوا اللہ فلا یستجیب لکم وقبل ان تستغفروہ فلا یغفر لکم۔	حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو! نیکی کا حکم دو اور بدی سے روکو قبل اسکے کہ وہ وقت آئے جب تم اللہ سے دعا کرو تو تمہاری دعا نہ سنی جائے اور توبہ کرو تو قبول نہ ہو۔

اس زمانہ میں ہماری جو حالت ہو رہی ہے ان آیات و احادیث کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل اس اہم فریضہ (تبلیغ) کو چھوڑنے ہی سے ہم عذاب الٰہی میں مبتلا ہوئے ہیں۔ حشر کیسا ہوگا وہ بھی سن لیجیے۔

عن عبد الرحمن بن عوف عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لیخرجن من امتی من قبورھم فی صورۃ القردۃ والخنازیر بمداھنتھم فی المعاصی وکفھم عن النھی وھم یستطیعون (تذکرہ عبدالرحمن بن عوف)	حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل ہے کہ قسم ہے اس ذات کی جسکے قبضہ میں میری جان ہے کہ میری امت کے کچھ لوگ قبروں سے بندروں اور سوروں کی صورت میں اٹھینگے گناہوں میں مداہنت برتنے کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ انکو قدرت تھی اور پھر وہ برائیوں کے روکنے سے باز رہے

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فلاح کا مدار ہی چار چیزوں پر رکھا ہے:۔

والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا وعملوا الصلحت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔	زمانہ گواہ ہے کہ تمام انسان نقصان میں ہیں مگر وہ (۱) جو ایمان لائے (۲) جنہوں نے نیک عمل کیے (۳) ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی (۴) ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔

(۱) ایمان، یعنی صرف اللہ کے الٰہ اور رب ہونے کا اقرار اور اللہ کے رسول کی تعلیم کو قبول کرنا۔

(۲) نیک عمل، یعنی اُس لائحۂ عمل پر چلنا جو خدا نے اپنے رسول کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ اس سے ہٹ کر کسی عمل کا نام عملِ صالح نہیں ہے۔

(۳) تواصی بالحق، یعنی اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی اسی ایمان اور عمل صالح کی طرف دعوت دینا۔

(۴) تواصی بالصبر، یعنی ہر قسم کی مشکلات اور مصائب کے مقابلہ میں حق پر خود قائم رہنا اور دوسروں کو بھی ڈٹے رہنے پر آمادہ کرنا۔

یہ چار چیزیں ہیں جنکے فقدان کا لازمی نتیجہ قرآن کی رو سے خسران ہے۔ پس اگر آپ خسران سے بچنا چاہتے ہیں اور فلاح کے خواہشمند ہیں تو آپ کے لیے ان نکات چہارگانہ کے سوا کوئی دوسرا پروگرام نہیں ہے۔ اسکو چھوڑ کر کسی دوسرے پروگرام پر آپ چلینگے تو جو انجام اب تک دیکھا ہے آئندہ اس سے بھی برا انجام دیکھینگے۔ لتکونوا شھداء علی الناس میں امامت کا منصب جو آپکو عطا ہوا ہے اسکو اپنے کاندھوں سے اتار کر آپ کس طرح امید رکھتے ہیں کہ دنیا میں امامت کی سعادت آپکو نصیب ہوگی اور قیامت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت آپ کے حق میں ہوگی۔ واللہ یھدی من یشاء الی سبیل الرشاد۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم پر تنقیدی نظر

(از جناب خان بہادر نواب محمد ذکار اللہ خاں صاحب رٹائرڈ کلکٹر یو۔پی)

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش کے عنوان سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدیر ترجمان القرآن کے مضامین کے دو مجموعے ۱۳۵۷ھ میں اور اُس سے پہلے شائع ہوئے تھے۔ میں نے مولانا کے اُن مضامین پر نیز مولانا کے حامی اور مؤید مولانا منظور صاحب نعمانی کے مضامین پر جو موصوف نے مولانا مودودی صاحب کی تائید میں تحریر فرمائے تھے اسی وقت کچھ تنقیدی مضامین بعنوان "مسلمان اور موجودہ سیاسی جنگ" لکھے تھے جس میں سے بعض ترجمان القرآن میں اور بعض دیگر رسالوں میں ابتداءً شائع ہوئے اور جن میں سے بعض کا جواب بھی مولانا مودودی صاحب نے دیا اور اُن میں سے چار مضامین ایک رسالہ کی صورت میں بھی شائع ہو چکے ہیں (دیکھو میرا رسالہ "مسلمان اور موجودہ سیاسی جنگ" مطبوعہ لطیفی پریس دھلی)۔ مولانا مودودی صاحب نے اپنے مضامین میں (جو پہلے مجموعہ میں شائع ہوئے ہیں) سیاسی کام کرنیکے اکثر ان طریقوں کو غلط اور مسلمانوں کے لیے مضر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی جن پر مسلمانوں کے مختلف گروہ عمل پیرا ہیں۔ مگر خود اپنا نصب العین اور اپنا طریقہ کار مسلمانوں کے سامنے پیش نہیں کیا تھا۔[1] لہٰذا مسلمانوں کو عموماً اور ترجمان القرآن کے ناظرین کو خصوصاً مولانا

[1] اُسی کتاب میں تین مستقل باب سیاسی نصب العین، راہِ عمل اور قرآن و اسوۂ رسول کی رہنمائی کے عنوان پر موجود ہیں، اور پھر شبہات اور جوابات کے عنوان سے نصب العین اور طریق کار کی مزید توضیح بھی کی گئی ہے مگر خان بہادر صاحب فرماتے ہیں کہ کوئی نصب العین اور طریق کار پیش نہیں کیا گیا۔ یہ عجیب طرز بحث ہے۔ اگر آپکا دل کسی چیز کو قبول نہیں کرتا تو راست بازانہ طریقہ یہ ہے کہ آپ صاف کہدیں کہ جو کچھ تم نے پیش کیا وہ ہمیں قبول نہیں لیکن بجائے یہ کہنے کے آپ یہ کہتے ہیں کہ تم نے سرے سے کوئی چیز پیش ہی نہیں کی۔ م

موصوف سے یہ شکایت[1] تھی کہ اگر مسلمان مولانا کے تخریبی استدلال سے متاثر ہو کر دیگر سیاسی گروہوں سے اشتراک عمل ترک کر دیں تو ایسا کرنیکے بعد خود کیا کریں؟ آیا معطل ہو کر بیٹھ جائیں یا کوئی نیا طریقہ کار اختیار کریں؟ مسلمانوں کے اس احساس کی ترجمانی کرتے ہوئے راقم الحروف نے ایک استفسار مولانا ممدوح کی خدمت میں روانہ کیا تھا جس میں علاوہ اور باتوں کے مولانا سے دریافت کیا گیا تھا کہ

(۱) موجودہ سیاسی جنگ میں مسلمانوں کو کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے؟

(۲) اسمبلیوں اور کونسلوں کے انتخاب کا وقت اگر آوے اس کے لیے مسلمانوں کو اپنا نمایندہ کھڑا کرنا چاہیے یا نہیں؟

(۳) اگر کھڑا کرنا چاہیے تو وہ نمایندہ کانگرسی ہو یا مسلم لیگی؟

(۴) اگر کسی ایک جگہ کے لیے دو نمایندے کھڑے ہوں ایک کانگریسی دوسرا مسلم لیگی تو عام رائے دھندگان کو کانگریسی امیدوار کو رائے دینا چاہیے یا مسلم لیگی امیدوار کو؟

(۵) اگر ایسے انتخاب کے وقت مسلمانوں کو نہ کانگریسی امیدوار کو رائے دنیا چاہیے نہ مسلم لیگی امیدوار کو تو مسلمانوں میں کوئی تیسری جماعت ہے کہ مسلمانوں کو اسکے امیدوار کو رائے دینا چاہیے؟ اگر ہے تو وہ کونسی جماعت ہے؟

(۶) اگر مسلمانوں کی کوئی سیاسی جماعت میدانِ سیاست میں ایسی موجود نہیں ہے جو اسکی اہل ہو کہ اسکے نمایندہ کو مسلمانوں کو رائے دینا چاہیے تو کیا آپ کی رائے ہے کہ مسلمانوں کو اس وقت ان انتخابات میں حصہ لینے سے اور ان اسمبلیوں اور کونسلوں میں اپنے نمایندے بھیجنے سے پرہیز کرنا چاہیے اور مسلمانوں کو تعطل کی پالیسی اختیار کرنا چاہیے؟ اگر ایسا ہے تو آپ کو صاف صاف اظہار

---

[1] اپنی شکایت کو آخر عام شکایت قرار دینے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کے پاس یہ معلوم کرنے کا ذریعہ کیا ہے کہ یہ شکایت عام تھی؟ - م

کر دینا چاہیے ؟ ......

اسی کے ساتھ آپکو یہ بھی صاف صاف کہدینا چاہیے کہ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں اور ان صوبوں کی وزارتیں مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں ان وزارتوں سے مسلمانوں کو استعفا دیدینا چاہیے اور ان صوبوں کی وزارتوں پر بھی غیر مسلموں کو قابض ہو جانے دینا چاہیے یا نہیں ؟

یہ استفسار راقم الحروف نے مولانا مودودی صاحب کی خدمت میں ایک خط کی صورت میں روانہ کیا تھا اور درخواست کی تھی کہ مولانا موصوف اس استفسار کو معہ اپنے جواب کے ترجمان القرآن میں مسلمانوں کی اطلاع کے لیے شائع فرمادیں۔

مولانا مودودی صاحب نے نہ میرا استفسار ترجمان القرآن میں شائع فرمایا نہ اس کا کوئی جواب دیا۔[^۱] اگرچہ جس پالیسی کے مولانا مودودی صاحب اپنے مضامین کے پہلے مجموعہ میں حامی تھے اسکے دیکھتے ہوئے مولانا مودودی صاحب کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ میرے استفسار کو اور نیز اسکے جواب کو ترجمان القرآن میں عام مسلمانوں کی اطلاع کے لیے شائع فرماتے۔[^۲]

مولانا کا میرے استفسار کو نہ شائع فرمانا اور اسکے جواب سے پرہیز کرنا دو وجوہ پر مبنی ہو سکتا

---

[^۱]: ایک شخص مکہ کی طرف جانے کی تجویز پیش کرتا ہے اور اسکی ضرورت، اسکے مصالح اور راستہ کی تفصیلات بیان کرتا ہے - آپ اسکی ساری تقریر سننے کے بعد اٹھکر پوچھنا شروع کرتے ہیں کہ ٹوکیو کے راستے میں فلاں فلاں جگہ ضرورتاً پیش آنیکی انکا کیا بند وبست ہوگا؟ اور کلکتہ سے جو جہاز مشرق کو جاتے ہیں اُن میں سے کونسا بہتر ہے؟ اور ٹوکیو کے کس محلے میں قیام مناسب ہوگا؟ خدارا بتائیے کہ ایسے سوالات کا کیا جواب دیا جائے - آپکے سوالات سے ہی معلوم ہوگیا کہ پوری تقریر کے دوران میں آپ ٹوکیو ہی کا خواب دیکھتے رہے اور جو کچھ دوسرا کہہ رہا تھا اسکی طرف آپکا دھیان گیا ہی نہیں - اب کس امید پر آپکو جواب دیا جائے - جو جواب بھی دیا جائیگا اس میں آپ پھر ٹوکیو ہی ٹوکیو تلاش کرینگے - م

[^۲]: یعنی اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا بھی میرے فرائض میں سے ہے! - م

ہے - اولاً یہ کہ مولانا کے پاس اس کا کوئی جواب ہی نہ تھا[1] - ثانیاً یہ کہ جس جمود و تعطل کی طرف مولانا ممدوح کی تحریریں مسلمانوں کو لیجانا چاہتی تھیں اوس جمود و تعطل سے مولانا اپنے مصالح کی بناء پر مسلمانوں کو (جن کا علم مولانا ہی کو ہو سکتا ہے) نکالنا نہیں چاہتے تھے[2] - اگر پہلی صورت تھی تو مولانا مودودی صاحب پر لازم تھا کہ اس کا اعتراف فرماتے - اور اگر دوسری صورت تھی تو اس سے رجوع فرماتے - مگر مولانا نے ایسا نہیں کیا (میرا استفسار مذکور میرے رسالہ "مسلمان اور سیاسی جنگ" میں بطور تتمہ اول کے شائع ہو چکا ہے) - مولانا مودودی صاحب نے اگرچہ میرے استفسار کو نہیں شائع کیا نہ اس کا جواب دیا تاہم اپنے سیاسی مضامین کے دوسرے مجموعہ میں مولانا نے اپنا نصب العین نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا تھا - اسکے حاصل کرنیکے طریقہ کے متعلق مولانا کا ارشاد تھا کہ وہ نصب العین بغیر انقلابی ذرائع اختیار کیے ہوئے حاصل نہیں ہو سکتا - میں نے اپنے دو مضامین میں جن میں سے اول "ترجمان القرآن" میں بھی چھپ چکا ہے اور نیز میرے رسالہ "مسلمان اور سیاسی جنگ" میں بطور تتمہ ثانی کے چھپا ہے اور دوسرا الہلال دہلی میں چھپا ہے مولانا مودودی صاحب سے ان انقلابی ذرائع کے معلوم کرنیکی ہر چند کوشش کی مگر میں مولانا سے کوئی تشفی بخش جواب حاصل کرنے میں ناکام رہا[3] - مولانا فرماتے ہیں "میں حیران ہوں کہ اس کا کیا جواب دوں جب تک

---

[1] بلا شبہ سوالات لاجواب تھے - م

[2] یقیناً اگر مسلمان مکہ کی طرف چلنے پر راضی نہ ہوں تو میں اپنی حد تک انتہائی کوشش کروں گا کہ وہ ٹوکیو کی طرف ایک انچ نہ بڑھنے پائیں - م

[3] اُسی وقت عرض کر دیا گیا تھا کہ انقلابی ذرائع کی فہرست بنا کر پیش نہیں کی جایا کرتی - یہ ریفارم اسکیم نہیں ہے، نقشۂ جنگ ہے - اس کا صرف اصولی خاکہ پیش کیا جا سکتا ہے، تفصیلات از ابتدا تا انتہا پہلے ہی قدم پر مرتب نہیں کی جا سکتیں - مگر مشکل یہ ہے کہ خان بہادر صاحب کسی طرح اس بات کو سمجھ نہیں سکتے کیونکہ انکے ذہن کی پوری ساخت برطانوی ہند کے کانسٹی ٹیوشن پر ڈھلی ہوئی ہے اور الکشن، کونسل، ووٹ اور اسی خاندان کی دوسری چیزوں کے باہر اُن کا تصور کسی طرف جا ہی نہیں سکتا - م

قوم کی ایک بڑی تعداد ایک نصب العین پر متحد نہ ہو جائے اور ہر قیمت پر اُسے حاصل کرنیکا عزمِ صمیم اس میں نہ پیدا ہو جائے "۔ انقلابی ذرائع کی ایک فہرست پیش کر دینا کسی یاوہ گو ہی کا کام ہو سکتا ہے اور میں یاوہ گوئی سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں "۔

بہر حال مولانا کے مضامین کے پہلے مجموعہ نے مسلمانوں کو جس جمود اور تعطل کی حالت میں ڈالنے کی کوشش کی تھی مولانا کے مضامین کے دوسرے مجموعہ نے اسکی کسی طرح تلافی نہیں کی بلکہ اس جمود اور تعطل کو اپنی جگہ اور مضبوط کر دیا۔ اور یہی جمود اور تعطل کی پالیسی ہے جسکے خلاف میں نے اپنے جملہ مضامین میں جو رسالہ "مسلمان اور سیاسی جنگ" میں شائع ہوئے ہیں صدائے احتجاج بلند کی ہے۔

اب مولانا مودودی صاحب کے مضامین "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کا حصہ سوم جو ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۹ھ کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا ہے اور نیز مولانا کے مضامین کا وہ مجموعہ جو محرم سنہ ۱۳۶۰ھ کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا ہے میرے پیش نظر ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ مضامین بھی کوئی تعمیری پہلو لیے ہوئے ہیں یا اُن میں بھی سوائے تخریب کے اور جمود و تعطل کی تعلیم کے اور کچھ نہیں ہے[1]۔ ان مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے ممکن ہے کہ مجھکو مولانا کے مضامین سے طویل اقتباسات ہدیہ ناظرین کرنا پڑیں جسکی میں ناظرینِ کرام سے پہلے ہی سے معافی چاہتا ہوں "اصلی مسلمانوں کے لیے ایک ہی راہ عمل" کا عنوان قائم کر کے مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں :-

[1] "جمود" اور "تعطل" خان بہادر صاحب کی مخصوص اصطلاحیں ہیں جن کا مفہوم سمجھنے میں شاید ناظرین کو زحمت پیش آئے۔ دراصل خان بہادر صاحب کسی ایسی حرکت کو سرے سے حرکت ہی تسلیم نہیں کرتے جو اُس راستہ پر نہ ہو جس پر وہ خود چل رہے ہیں اس کی جانب مخالف کی طرف جو حرکت ہو اس کا نام انکی اصطلاح خاص میں جمود اور تعطل ہے اگر وہ مشرق کی طرف جانا چاہتے ہوں اور دوسرا ان سے اختلاف کر کے مغرب کی طرف چل پڑے تو خواہ وہ غریب کتنی ہی تیز رفتاری سے چل رہا ہو مگر خان بہادر صاحب کہینگے کہ وہ چل ہی نہیں رہا، جامد کھڑا ہے۔ م

(دیکھو ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۰ھ صفحہ ۱ تا صفحہ ۱۱)

"اسلام تمام عالم انسانی کے لیے بنیادی اصلاح کا ایک پیغام اور عملی اصلاح کا ایک پروگرام لیکر آیا ہے۔ اسکا پیغام یہ ہے کہ تمام انسان اللہ وحدہٗ لاشریک کی حاکمیت تسلیم کریں حتی کہ اسکے حکم کے سوا ہر دوسرا حکم باطل ہو جائے۔ اور اس کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں وہ ایک جتھا بنا کر اپنا پورا زور اس بنیادی اصلاح کو عملاً نافذ کرنے میں صرف کر دیں یہانتک کہ اشخاص کی، خاندانوں کی، طبقوں کی، قوموں کی اور نسلوں کی فرمانروائی اور جمہور کی حکومت خود اختیاری بالکلیہ مٹ جائے اور خدا کی سلطنت میں اسکی رعیت پر صرف اسی کا قانون عملاً جاری ہو"

(۲) "مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں پر مجھے جو کچھ اعتراض ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے کو مسلم (یعنی متبعین انبیاء) کہنے کے باوجود انہوں نے اس نصب العین اور اس راہ عمل کو چھوڑ کر ایسے مقاصد اور طریقے اختیار کیے ہیں جنکو اسلام سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہے"

(۳) "یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ قومیت اور قومی اغراض قابلِ تبلیغ چیزیں نہیں ہیں۔ مثلاً جرمنیت، اطالویت، انگریزیت یا ہندویت کے متعلق کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ انکی طرف دوسروں کو دعوت دی جا سکتی ہے۔ یہ کوئی اصول نہیں ہیں کہ ہر انسان کے سامنے انکو پیش کیا جا سکے۔ یہ تو نسل، تاریخ، تمدن کے بینے ہوئے بے لچک دائرے ہیں"

(مشکل یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب کو اپنے نظریات اور اپنے مسلمات یاد نہیں رہے ورنہ وہ نہ فرماتے کہ ہندویت یا انگریزیت میں کوئی قوت تبلیغ نہیں ہے۔ بس مولانا کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اپنے مضامین کے مجموعہ میں جہاں وہ مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت کے خدشات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں وہاں وہ صاف الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کا کانگریس اور ہندو اکثریت

کے ساتھ اس قسم کا اشتراک عمل رہا جو اس وقت اُن مسلمانوں کا ہے جو کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کے حامی ہیں تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ آج جو مسلمان اپنے آپ کو عبداللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں ایک دو نسلوں کے بعد رام دیو کے نام سے یاد کیے جانے لگیں اور جو مسلم خواتین اس وقت صالحہ کے نام سے موسوم ہیں وہ ایک دو نسلوں کے بعد شریمتی بملا دیوی اور شریمتی سیتا دیوی کہلائی جایا کریں ۔ اسی طرح انگریزی یا مغربی تمدن بھی تبلیغی روح سے بالکل معرا نہیں ہے ۔ چنانچہ ایک جگہ سیاسی کشمکش حصہ اول میں مولانا کا ارشاد ہے :

"سیاسی اقتدار سے محروم ہونے کے بعد جاہ و عزت کی بھوک پیدا ہوئی اور معاشی وسائل سے محروم ہونیکے بعد روٹی کی بھوک ۔ ان دونوں چیزوں کے حصول کا ذریعہ صرف ایک ہی رکھا گیا اور وہ مغربی تعلیم کا دروازہ تھا ۔ روٹی اور عزت کے بھوکے لاکھوں کی تعداد میں ادھر لپکے ۔ وہاں ہاتف غیب نے پکار کر کہا کہ آج روٹی اور عزت مسلمان کے لیے نہیں ہے ۔ یہ چیزیں اگر چاہتے ہو تو نامسلمان بن کر آؤ"

سیاسی کشمکش حصہ دوم کے دیباچہ میں مولانا فرماتے ہیں ۔

"مغربی تعلیم کے تجربہ سے کیا ثابت ہوا؟ یہ کہ جو ماحول ہم پر مسلط ہے اس میں سے محض ایک عنصر یعنی تعلیم کو ہم دوسرے عناصر سے الگ کرکے نہیں لے سکتے ۔ دوسرے عناصر جنکے ساتھ اس عنصر کا غیر منفک رابطہ ہے خود بخود اسکے ساتھ آتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ان سب کے جمع ہو جانے سے مسلمان خود بخود نامسلمان بنتا چلا جاتا ہے"

مولانا کے مضامین کے ان اوپر کے اقتباسات سے خود ثابت ہوتا ہے کہ ہندوئیت اور انگریزیت بھی کچھ نہ کچھ تبلیغی روح اپنے اندر رکھتی ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے ، اگر وہ تبلیغی روح سے بالکل معرا ہیں تب تو ہم مسلمانوں کو ہندوؤں یا انگریزوں سے زندگی کے کسی شعبہ میں خواہ وہ تعلیم ہو

یا تجارت، سیاست ہو یا مدنی معاشرت، اشتراکِ عمل کرنے سے احتراز کرنیکی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ قومیں بقول مولانا ممدوح کے اپنے میں کوئی تبلیغی روح رکھتی ہی نہیں ہیں، اسلیے وہ ہم مسلمانوں پر کوئی اچھا یا برا اثر نہیں ڈال سکتیں۔ اگر ہمارے اور ان قوموں کے اشتراکِ عمل کا کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے تو یہی کہ وہ ہمارے تبلیغی مشن سے کچھ نہ کچھ متأثر ہو جائیں، وہو المقصود)[1]

۱؎ یہاں خان بہادر صاحب نے تبلیغی جذب و کشش کو سیاسی جہانگیری اور قومی جہانگیری کے طریقوں سے خلط ملط کر دیا ہے حالانکہ یہ تین چیزیں بالکل مختلف نوعیت رکھتی ہیں۔ تبلیغی جذب و کشش کی نوعیت یہ ہے کہ انسانوں کی ایک جماعت محض چند اصول لیکر اٹھتی ہے، اور بلا امتیازِ قومیت و نسل و وطن تمام انسانوں کے سامنے ان اصولوں کو پیش کرتی ہے اور جو کوئی انکو قبول کرے اسے بالکل اس طرح اپنا لیتی ہے کہ نئے آنے والے رکن اور پرانے ارکان کے درمیان کسی حیثیت سے بھی کوئی فرق و امتیاز نہیں ہوتا بلکہ وہ ان میں مل کر یکجان ہو جاتا ہے۔ اسکی پرانی مثالیں اسلام، بودھ مت اور مسیحیت میں ملتی ہیں، اور اسکی نئی مثال بین الاقوامی اشتراکی تحریک میں مل سکتی ہے۔ سیاسی جہانگیری کی نوعیت یہ ہے کہ ایک ظالم قوم جب کسی غیر ملک پر قبضہ کرتی ہے تو اسکی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس ملک کے باشندوں میں کوئی قومی غیرت، کوئی احساسِ خودی اور کوئی عزتِ نفس باقی نہ رہے اور وہ اپنے آپ کو خود حقیر و ذلیل اور اپنے آقاؤں کو ہر کمال کا مظہر سمجھنے لگیں، تاکہ انکو آسانی سے محکوم بنا کر رکھا جا سکے۔ اس غرض کے لیے وہ اپنی تعلیم اور اپنی تہذیب ایک خاص طریقہ سے اُن میں پھیلاتی ہے اور انکی اپنی قومی خصوصیات کو مٹا کر انکو زندگی کے ہر شعبے میں اپنا نقال بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ قومی جہانگیری یہ ہے کہ ایک خود غرض قوم جب ایک ہی سرزمین میں دوسری قوموں کو اپنے ساتھ رہتے بستے پاتی ہے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ اس سرزمین کے سارے منافع اور وہاں حکومت کرنے کے سارے اختیارات بلا شرکتِ غیرے تنہا اسی کے قبضہ میں رہیں، تو وہ پہلے تو یہ کوشش کرتی ہے کہ ان دوسری ہم وطن قوموں کو فنا کر دے، جیسا کہ فرنگیوں نے امریکہ میں کیا، اور جب اس میں ناکامی ہوتی ہے یا ایسا کرنا خلافِ مصلحت معلوم ہوتا ہے تو وہ اُن قوموں کو ہضم کرنے کی کوشش کرتی ہے اور اس غرض کے لیے وہ سیاسی اقتدار سے کام لیکر ان قوموں کی

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۱۰ ملاحظہ ہو)

(۴) "دراصل ایک ملک پر نہیں بلکہ ساری دنیا پر چھا جانے کی قوت اگر ہے تو وہ صرف

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۹) خصوصیات کو مٹانے اور اپنی خصوصیات اُن پر مسلط کرنے کی مختلف تدبیریں اختیار کرتی ہے، جسکی مثال مملکت روس کی غیر روسی قوموں کو روسی بنانے (Russification) کی وہ کوششیں ہیں جو عہد زار میں کی جا رہی تھیں۔

میں نے سیاسی کشمکش حصہ اول و دوم میں انگریزوں اور ہندوؤں کی طرف جس چیز کو منسوب کیا ہے وہ تبلیغی جذب و کشش نہیں ہے بلکہ سیاسی جہانگیری اور قومی جہانگیری ہے۔ انگریز اور جرمن اور دوسری جہانگیر قومیں انگریزیت یا جرمنیت نامی کسی مذہب و مسلک کی تبلیغ نہیں کرتی ہیں، بلکہ صرف حکمرانی کی اغراض کے لیے دوسری قوموں کو بدقوما بنانے (Denationalise کرنے) کی کوشش کرتی ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی غیر انگریز یا غیر جرمن انکی زبان و تہذیب میں خواہ کتنا ہی رنگ جائے مگر بہرحال وہ انگریز یا جرمن نہیں بن سکتا۔ اسی طرح روسیوں نے وسط ایشیا میں جو پالیسی اختیار کی اور جس کو ہمارے ہندو ہموطن ہندوستان میں اختیار کرنا چاہتے ہیں اسکی نوعیت بھی کسی اصولی تبلیغ کی نہیں ہے بلکہ وہ ایک قوم کی طرف سے دوسری قوموں کو کھا جانے کی ایک جابرانہ اور فریب کارانہ کوشش ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسری قوموں کی امتیازی ہستی فنا ہو جائے اور یہ قوم اُن کو اپنا جزو بدن بنا کر طاقت حاصل کرے۔ اس دوسری شکل میں بھی عموماً وہ قومیں جنکو اس طرح شکار کیا جاتا ہے مساوی حیثیت سے اس قوم میں شامل نہیں ہوتیں بلکہ صرف بیہوش (Unconscious) کر کے مسخر کر لی جاتی ہیں اور بظاہر ایک قوم بن جانے پر بھی ان میں آقا اور غلام کا تعلق باقی رہتا ہے جیسا کہ شودروں کے معاملہ میں علانیہ دیکھا جا سکتا ہے۔

میں نے اپنی کتاب کے پہلے دونوں حصوں میں مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں کے اسی ناجائز طرزِ عمل پر چوکنا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور تیسرے حصہ میں ان کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ان دونوں ظالموں کے مقابلے میں اگر تم نیشنلزم کے اصولوں پر جدوجہد کرو گے تو خائب و خاسر رہو گے۔ ان ہتھیاروں سے نہ صرف یہ کہ تمہارا ان کے مقابلہ میں کامیاب ہونا محال ہے، بلکہ درحقیقت مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ ہتھیار تمہارے شایان

ایک ایسی اصولی تحریک ہی بن سکتی ہے جو انسان کو بحیثیت انسان کے خطاب کرتی ہو اور اس کے سامنے خود اسکی فلاح کے فطری اصول پیش کرتی ہو۔ قومیت کے برعکس ایسی تحریک ایک تبلیغی طاقت ہوتی ہے ..... اگر واقعہ یہی ہے اور مسلمانوں کی اصلی حیثیت ایک عالمگیر اصولی تحریک کے پیرؤوں اور داعیوں کی ہے تو وہ سارے مسائل یک قلم اُڑ جاتے ہیں جن پر اب تک مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی رہنما وقت ضائع کرتے رہے ہیں۔ مسلم لیگ، احرار، خاکسار، جمعیت العلماء اور آزاد مسلم کانفرنس سب کی اس وقت تک کی کارروائیاں حرفِ باطل کی طرح محو کر دینے کے لائق ٹھہرتی ہیں۔ نہ ہم قومی اقلیت ہیں، نہ آبادی کے فی صدی تناسب پر ہمارے وزن کا انحصار ہے، نہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی قومی جھگڑا ہے، نہ انگریزوں سے وطنیت کی بنیاد پر ہماری لڑائی ہے، نہ وہ حکومت ہمارے کسی کام کی ہے جو انگریز کی حاکمیت کے بجائے جمہور کی حاکمیت پر مبنی ہو، نہ اقلیت کے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے، نہ اکثریت کی بنا پر ہمیں قومی حکومت مطلوب ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے سوا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۱) شان بھی نہیں ہے۔ اس راہ چلنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا سے بھی نامراد ہو جاؤ گے اور آخرت میں بھی نامراد ہی رہو گے۔ بخلاف اسکے اگر تم اپنے اس تبلیغی مشن کو لے کر کھڑے ہو جاؤ جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے دراصل تمہارا مشن ہے تو یکایک میدان کا رنگ بدل جائیگا۔ بجائے اسکے کہ تم کسی کی سیاسی اور کسی کی قومی جہانگیری کے خوفناک حملوں سے کانپو اور لرزو، یہ سارے جہانگیر تم سے کانپنے لگیں گے اور صرف یہی نہیں کہ دنیا میں تم غالب ہو گے بلکہ آخرت میں بھی تم ہی سرخرو ہو گے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ سیدھی سی بات اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ کھول کھول کر بتا رہا ہوں کہ قوم پرستانہ طریقوں اور اصولی تبلیغ کے طریقوں میں کیا فرق ہے، مقدم الذکر کے اختیار کرنے میں کیا غلطی ہے اور اسکے نقصانات کیا ہیں، اور موخر الذکر کا اختیار کرنا کس طرح صحیح و معقول بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔ پھر زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ بھی بتا رہا ہوں کہ اگر نیشنلزم کی بنیاد سے ہٹا کر اپنی ساری سرگرمیوں کو اسلام کے تبلیغی مشن کی بنیاد پر قائم کرنا چاہو تو یہ ترتیب جدید (Readjustment) کس طرح ممکن ہے۔ مگر اللہ کے بندے صرف یہی نہیں کہ بات سمجھتے نہیں بلکہ لوگ تو اس جرم کی پاداش میں مجھ پر ایسے عجیب عجیب الزام تراش رہے ہیں جنہیں سن کر ہنسی آتی ہے۔

کسی کے محکوم نہ ہوں، ہندوؤں کی حاکمیت ختم ہو جائے اور حکومت اس قانون عدل کی قائم ہو جو اللہ تعالیٰ نے خود بھیجا ہے۔ اس مقصد کو ہم انگریز، والیانِ ریاست، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی اور مردم شماری کے مسلمان سب کے سامنے پیش کرینگے، جو اسے قبول کریگا وہ ہمارا رفیق ہے، اور جو اس سے انکار کریگا اُس سے ہماری لڑائی ہے بلا لحاظ اسکے کہ اس کی طاقت کتنی ہے اور ہماری کتنی۔ بلاشبہ اس سے ہمیں بہت کچھ نقصانات پہونچینگے مگر ایسے نقصانات اُٹھائے بغیر اسلامی تحریک نہ کبھی چلی ہے نہ کبھی چل سکتی ہے۔ جو کچھ جاتا ہے جانے دو۔ سید نا مسیح کے بقول جُبّہ جاتا ہے تو کرتا بھی چھوڑنے کے لیے تیار رہو جاؤ، تب ہی خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہوگی۔"

(۵) اسی طرح اس سوال کے جواب میں کہ "اصل اسلامی نصب العین کیا ہے" مولانا فرماتے ہیں:

"اس سوال کا جواب قرآن مجید میں جو دیا گیا ہے وہ یہ ہے۔ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ۔ اس آیت میں الہدیٰ سے مراد دُنیا میں زندگی بسر کرنیکا صحیح طریقہ ہے ...... دوسری چیز جو اللہ کا رسول لیکر آیا ہے وہ دینِ حق ہے۔ دین کے معنی اطاعت کے ہیں۔ کیش اور مذہب کے لیے جو دین کا لفظ استعمال ہوتا ہے یہ اسکا اصل معنی موضوع لہٗ نہیں ہے۔ دراصل دین کا لفظ وہی معنی رکھتا ہے جو زمانہ حال میں لفظ "اسٹیٹ" کے معنی ہیں۔ لوگوں کا کسی بالاتر اقتدار کو تسلیم کر کے اسکی اطاعت کرنا، یہ اسٹیٹ ہے، یہی دین کا بھی مفہوم ہے۔ اور "دین حق" یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کی خود اپنے نفس کی اور تمام مخلوقات کی بندگی چھوڑ کر صرف اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے۔ پس درحقیقت اللہ کا رسول اپنے بھیجنے والے کی طرف سے ایک ایسے اسٹیٹ کا

کا نظام لیکر آتا ہے جس میں نہ تو انسان کی خود اختیاری کے لیے کوئی جگہ ہے نہ انسان پر انسان

کی حاکمیت کے لیے کوئی مقام، بلکہ حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ جو کچھ بھی ہے صرف اللہ کے لیے ہے ...... پھر رسول کے بھیجنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اس نظام اطاعت (دین) اور اس قانونِ حیات (الہدیٰ) کو پوری جنس دین پر غالب کر دے۔"

اس اسلامی نصب العین تک پہونچنے کا سیدھا راستہ مولانا کے نزدیک یہ ہے:

"اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنیکے لیے راہ راست وہی ہے جو اللہ کے رسول نے اختیار کی، یعنی یہ کہ لوگوں کو "الہدیٰ" اور "دینِ حق" کی طرف دعوت دی جائے، پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر کے اپنی بندگی اور اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر دیں، دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ شریک کرنا چھوڑ دیں اور خدا کے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنا لیں انکا ایک مضبوط جتھا بنایا جائے، پھر یہ جتھا دین حق کو قایم کرنیکے لیے جہاد کبیر کرے، یہاں تک کہ اللہ کے سوا دوسری اطاعتیں جن جن طاقتوں کے بل پر قائم ہیں ان سب کا زور ٹوٹ جائے۔

اس راہِ راست کے تین جزء ہیں۔

(۱) انسانوں کو بالعموم اللہ کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنے اور اس کے بھیجے ہوئے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے۔

(۲) جتھا صرف ان لوگوں کا بنایا جائے جو اس دعوت کو جان کر اور سمجھ کر قبول کریں۔

(۳) تیسرا جزء یہ ہے کہ براہ راست غیر الٰہی نظام اطاعت پر حملہ کیا جائے۔"

ناظرین کرام نے مولانا کی تحریر سے اقتباسات مندرجہ بالا ملاحظہ فرمائے۔ ان تحریروں میں مولانا نے کس قدر ہوشیاری سے خلط مبحث کے ذریعہ سے مسلمانوں کی جملہ سیاسی جماعتوں کو عوام کی نظروں میں مردود و مبغوض قرار دینے کی کوشش فرمائی ہے[1]۔ جب مسلمانوں کا

[1] ماشاء اللہ! اس سلامت قلب و ذوق کی بھی کوئی (۱۱۳) حد ہے کہ مذکورۂ بالا عبارات میں آپ کو "ہوشیاری"

نصب العین زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا ہے یا ہونا چاہیے اور یہ مسلمانوں کی موجودہ سیاسی جماعتیں اسکو اپنا نصب العین قرار نہیں دیتیں تو وہ ضرور قابل احتراز و اجتناب ہیں۔ مگر مولانا ممدوح اس امر کو فراموش کر دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی موجودہ سیاسی جماعتیں مسلمانوں کو مسلمان سمجھ کر انکی تنظیم کا انتظام کرتی ہیں، وہ مسلمانوں کو نامسلمان یا مرتد قرار دے کر انکی تنظیم کا ادعا نہیں کرتیں کہ ان جماعتوں کے لیے یہ ضرور ہو کہ وہ مسلمانوں کو پہلے مسلمان بنالیں اسکے بعد ان کی تنظیم کریں۔ اگر موجودہ مسلمان نامسلمان یا مرتد نہیں ہیں اور اُن میں کچھ بھی ایمان کی رمق باقی ہے اور ان کا نصب العین زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا ہے تو وہ اپنی نئی تنظیم کے بعد خواہ وہ مسلم لیگ کے طریقہ پر ہو خواہ احرار خاکسار اور جمعیت العلماء کے زیر اثر ہو اپنے نصب العین کے حصول کے زیادہ اہل بن جاوینگے مسلم لیگ یا دیگر موجودہ سیاسی جماعتیں مسلمانوں سے یہ نہیں کہتیں کہ تم اپنے کسی نصب العین کو جو ممدوح و مطلوب ہو ترک کر دو۔ نہ وہ ایسے نصب العین کے حصول میں کسی طرح مزاحم ہوتی ہیں[۱]۔ اگر مولانا مودودی صاحب کے نزدیک آجکل کے "مردم شماری" کے مسلمان مسلمان نہیں ہیں بلکہ نامسلمان ہیں اور وہ کوئی پسندیدہ نصب العین نہیں رکھتے اور اس کی ضرورت ہے کہ ان کو نامسلمان سے مسلمان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۳) "خلط مبحث" اور "سیاسی جماعتوں کو مبغوض بنانے کی کوشش" کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ خان بہادر صاحب مجبور ہیں کہ اس قسم کی عبارتوں میں کوئی دوسری چیز وہ پا نہیں سکتے کیونکہ کسی نئی چیز کے اخذ کرنے کی منزل سے وہ گذر چکے ہیں، اور اب اگر کوئی ایسی چیز وہ دیکھتے ہیں جو ان کے لیے نئی ہو تو اسکے اندر انکو وہی پرانی باتیں نظر آتی ہیں جن سے وہ مانوس رہے ہیں۔ م

[۱] ان ساری باتوں کا جواب میری کتاب سیاسی کشمکش حصہ سوم میں موجود ہے خصوصاً صفحات ۴۰ تا ۴۳، ۵۸ تا ۵۹، ۹۱ تا ۱۰۲، ۱۰۴ تا ۱۰۷، ۱۱۰ تا ۱۱۸، ۱۳۱ تا ۱۳۴، ۱۳۷ تا ۱۴۹ کوئی پڑھے تو اس قسم کے اعتراضات اسکے ذہن میں پیدا ہو ہی نہیں سکتے مگر جب کوئی شخص دوسرے کی عبارت میں اپنے مفروضات اور ظنون و اوہام پڑھنے لگے تو اسکے اعتراضات کا رفع ہونا قطعی محال ہے اس سلسلہ میں تنہا ایک خان بہادر صاحب ہی نہیں، متعدد حضرات کی طرف سے مجھے ایسا تلخ تجربہ ہوا ہے کہ اب یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ میری فلاں فلاں عبارتیں پڑھ لیجیے۔ م

بنایا جاوے اور اُن کے سامنے ایک پسندیدہ نصب العین رکھا جاوے تو مولانا مودودی صاحب اور اُنکے ہم خیال بزرگ آویں اور مسلمانوں کو اصلی معنی میں مسلمان بناویں اور اُن کے سامنے پسندیدہ نصب العین رکھیں[1] مسلم لیگ یا کوئی دوسری جماعت ہرگز کسی ایسے اقدام میں مولانا کی مزاحم نہیں ہوگی بلکہ جہاں تک ہو سکیگا اُنکی ممد و معاون ثابت ہوگی[2] - خدارا خود بھی کچھ کام کیجیے اور دوسروں کو بھی کام کرنے دیجیے، یہ کونسی خدمت دین یا اسلام ہے کہ نہ خود کچھ کریں نہ دوسروں کو کرنے دیں[3]

مولانا کا یہ نظریہ کہ موجودہ "مردم شماری کے" یا "نسلی" مسلمان دراصل مسلمان نہیں ہیں اور اُن میں ایمان کی کوئی رمق باقی نہیں ہے سرے سے غلط ہے[4] - انہیں مردم شماری کے مسلمانوں کے افراد میں مولانا حسین احمد مدنی بھی ہیں مولانا عبید اللہ سندھی بھی ہیں مولانا اشرف علی صاحب

---

[1] آئیں اور بنائیں اور رکھیں کیا معنی؟ میں تو یہ کام کر ہی رہا ہوں - جس کتاب پر جناب اس قدر شدت کے ساتھ تنقید فرما رہے ہیں وہ بھی اسی سلسلہ کا ایک کام ہے - م

[2] غالباً جناب کی یہ تنقید بسلسلۂ معاونت ہی ہے! اور شاید یہ بھی معاونت ہی کی کوئی قسم ہے کہ اس وقت لیگ کے حلقوں میں میرے خلاف بے اصل الزامات اور غلط فہمیوں کی اشاعت کا ایک طوفان برپا ہے - میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ مزاحمت نہ کریں، بلکہ میں چاہتا ہوں کہ جب آپ مزاحمت کرتے ہیں تو اس قسم کے چلتے ہوئے عوام فریب فقرے نہ لکھیے - مزاحمت کیجیے اور صاف کہیے کہ ہم تیری مزاحمت کرینگے - م

[3] دراصل میں اس ذہنیت کو سمجھنے سے بالکل عاجز ہوں جسکے تحت اس قسم کے فقرے کہے اور لکھے جاتے ہیں - اگر کوئی شخص کسی مسلک میں غلطی دیکھتا ہے اور اسکی اصلاح کی کوشش کرتا ہے، یا اسکی غلطی واضح کر کے اپنے نزدیک جو بہتر مسلک سمجھتا ہے اسے اختیار کرنے کا لوگوں کو مشورہ دیتا ہے تو آخر اس کا یہ مطلب کیسے ہوگیا کہ وہ نہ خود کچھ کرنا چاہتا ہے اور نہ دوسروں کو کچھ کرنے دیتا ہے؟ آخر کیوں غلط کو غلط نہ کہا جائے اور جس چیز کو آدمی صحیح سمجھتا ہو اسکی طرف کیوں نہ دعوت دے؟ آپ ایک ایماندار آدمی سے اس مداہنت کی توقع کیوں کرتے ہیں کہ جس طریقہ کو وہ حق کے خلاف پاتا ہے اس کی خرابیاں لوگوں کو سمجھانے کی کوشش نہ کرے؟ — م

[4] یہ آخر میں نے کب کہا کہ ساری قوم غیر مسلم ہوگئی ہے اور اس میں ایمان کی رمق بھی باقی نہیں؟ میں نے تو ان اعتقادی اور اخلاقی بیماریوں کو کھول کر بیان کیا ہے جو بالعموم مسلمانوں میں اس وقت پائی جاتی ہیں اور جن کی وجہ سے مسلمان تنزل اور کمزوری میں مبتلا ہیں - ان بیماریوں کا جائزہ لینے کی کوئی غرض اسکے سوا نہیں ہے کہ اِن کا جو صحیح اصولی علاج ہے اسکی ضرورت و اہمیت

(بقیہ صفحہ ۱۱۶ پر)

تھانوی بھی ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی بھی ہیں اور اگر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو ان مردم شماری کے مسلمانوں کا ایک فرد ہونا باعث عار نہیں ہے تو وہ خود بھی اسی برادری کے ایک فرد ہیں اور انہی جیسے ہزاروں دوسرے خدا کے بندے، اسی امت مرحومہ کے افراد ہیں اور اس کا فرد ہونا اپنے لیے باعث صد عزت و افتخار خیال کرتے ہیں۔ اگر ان میں سے سب یا بعض اس کے اہل ہیں کہ وہ مسلمانوں کے سامنے فرض کفایہ کی تعمیل میں اسلام کا صحیح نصب العین رکھیں تو وہ ضرور ایسا کریں گے اور امت محمدیہ اسکو اختیار کریگی اور اُسکے حصول کی کوشش کرے گی۔ اگر ان "نسلی" یا "مردم شماری" کے مسلمانوں میں کچھ بھی نور ایمان اور جذبہ اعلاء کلمۃ اللہ باقی ہے تو وہ جذبہ ضرور کچھ نہ کچھ اپنا اثر دکھائے گا خواہ انکی تنظیم مسلم لیگ کے طریقہ پر ہو خواہ کسی دوسرے طریقہ پر۔ بہر نوع مسلمانوں کی یہ تنظیم کسی ایسے جذبہ کو روک نہیں سکتی نہ اسکا یہ ادعاء ہے کہ وہ اسکو روکے گی بلکہ ہر امکانی طریقہ سے اس جذبہ کو ابھارے گی۔ یہ دراصل ایک سخت مغالطہ ہے کہ مسلمانوں کی اگر مسلم لیگ کے یا کسی دوسری سیاسی جماعت کے طریقہ پر تنظیم ہو جائے تو مسلمانوں میں اگر کوئی جذبہ اپنی دینی یا دنیاوی اصلاح کا ہے یا کوئی ولولہ اعلاء کلمۃ اللہ کا ہے وہ سرد پڑ جائیگا یا یہ تنظیم اسکی مزاحم ہوگی یا اسکو روک دیگی۔ آخر کوئی وجہ بھی تو سمجھ میں آوے کہ اگر ہم مسلمانوں میں کوئی جذبہ اپنی دینی یا دنیاوی اصلاح کا کارفرما ہے یا آئندہ کو کارفرما ہو تو مسلمانوں کی سیاسی تنظیم اس جذبہ کو کیوں بجھا دیگی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۵) ان لوگوں کو محسوس کرائی جائے جو اس قوم کے اندر صحیح العقیدہ و صالح العمل ہیں۔ میری اس کوشش کو غلط پیرایہ میں تعبیر کر کے آپ لوگ مسلمانوں کو دھوکا کیوں دیتے ہیں؟ کیا مسلم لیگ کا کام ان خلاف اخلاق و دیانت تدبیروں کے بغیر نہیں چل سکتا — م

[1] بشرطیکہ آپ جیسے حضرات صد عن سبیل اللہ کی کوششوں سے باز رہیں اور بیچاری امت محمدیہ کو غلط فہمیوں میں مبتلا نہ کریں۔ م

[2] میں اپنے مضمون "اسلام کی راہ راست اور اس سے انحراف کی راہیں" میں تفصیل کے ساتھ بتا چکا ہوں کہ یہ غلط طرز تنظیم کس طرح اسلامی مقصد کے خلاف ہے۔ م

یہ مغالطہ اگر مولانا مودودی صاحب کو نادانستہ ہے تو درخواست کرونگا کہ وہ اپنے استدلال کے مقدمات اور نتائج پر نظر ثانی فرمادیں اور اگر دیدہ و دانستہ وہ مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کو بھی مغالطہ میں ڈالنا چاہتے ہیں تو میری درخواست ہوگی کہ وہ اس سے تائب ہوں۔ دراصل یہ مغالطہ اُس غلط مبحث کا نتیجہ ہے جسکے مولانا مودودی صاحب عادی ہیں۔ مسلمانوں کو موجودہ سیاسی دور میں سیاسی تنظیم کی ضرورت ہے۔ ایک جماعت یا چند جماعتیں انکی سیاسی تنظیم کے لیے کھڑی ہوتی ہیں۔ اس وقت یہ بحث ہی بالکل غیر متعلق ہے کہ مسلمان اس وقت کیسے مسلمان ہیں، وہ نسلی ہیں یا اصلی۔ اُنکا اسلام اور ایمان صحابہ رضی اللہ عنہم جیسا ایمان و ایقان ہے، یا آجکل کے عرب بدوؤں جیسا، یا ہندو ریاستوں کے نومسلموں جیسا۔ سیاسی تنظیم کے وقت موجودہ مسلمانوں کے ایمان کی قوت و ضعف کی بحث ہی غیر متعلق ہے۔ تنظیم تو موجودہ مسلمانوں کی کی جاتی ہے خواہ وہ اچھے ہیں یا برے۔ ان کا اسلام قوی ہے یا ضعیف۔ مسلمانوں کی ایک جماعت محسوس کرتی ہے کہ ان میں تنظیم نہیں ہے، وہ انکی تنظیم کرنا چاہتی ہے۔ آپ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کا اسلام صحیح اسلام نہیں، ان کا ایمان قوی نہیں ہے۔ آپ ان میں صحیح اسلام کی روح پھونکنے کی کوشش کیجیے اور ان کے اخلاق، اطوار، عادات درست کرنے کی کوشش کیجیے۔ آپ اُن میں وہ صفات پیدا کرنے کی کوشش کیجیے جو کہ ایک پکے مومن میں ہونا چاہییں۔ آپ اپنا کام کیجیے۔ جو جماعتیں مسلمانوں کی تنظیم کا کام کرنا چاہتی ہیں انہیں وہ کام کرنے دیجیے۔ آپ کے کام میں اور ان کے کام میں نہ کوئی تصادم کی وجہ ہے نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ آپ ان کے اور وہ آپ کے کام میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ کسی جماعت سے جو مسلمانوں کی فلاح کا ایک کام کرنا چاہتی ہے یہ کہنا کہ تم مسلمانوں کی فلاح کے دوسرے کام کیوں نہیں کرتے بے عقلی نہیں تو اور کیا ہے[1]۔ ہاں اگر موجودہ "نسلی"

---

[1] یہ تمام سطحی باتیں ہیں جو بلا تفکر و تدبر کہی جا رہی ہیں۔ آپکے نزدیک اصل معاملہ ایک قوم کی "فلاح" کا ہے اور اس فلاح (بقیہ ص۱۱۸ پر)

مسلمان مودودی صاحب کے نزدیک بالکل نامسلمان ہیں اور ان میں شمہ بھر ایمان باقی نہیں ہے تو بات ہی دوسری ہے۔ تاہم ان کی تنظیم کے کام پر بھی مولانا مودودی صاحب کو اعتراض کا حق نہیں پہنچتا کیونکہ وہ نامسلمان ہیں ان کی تنظیم یا عدم تنظیم سے ایک سچے اور اصلی مسلمان کو کیا سروکار۔ مسلم لیگ اور مسلمانوں کی دیگر سیاسی جماعتوں کا مقصد اولیٰ اس وقت سیاسی تنظیم ہے۔ اگر یہ مقصد فی نفسہٖ مذموم ہے تو ضرور آپ مسلمانوں کو ان سیاسی جماعتوں سے کلی احتراز و اجتناب کی ہدایت کیجیے۔ لیکن اگر یہ مقصد بذاتہٖ حسن اور ممدوح ہے تاہم اگر آپ اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعہ سے مسلمانوں کو ان سیاسی جماعتوں کی شرکت سے روکتے ہیں اور اس ذریعہ سے ان سیاسی جماعتوں کی قوت

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۷) کی مختلف صورتیں آپکے ذہن میں ہیں جنکے درمیان باہم کسی ربط کی ضرورت نہیں۔ آپ اس طرح سوچ رہے ہیں کہ کوئی اس قوم کی معاشی فلاح کا شعبہ سنبھال لے اور دنیا میں جو معاشی طریقے چل رہے ہیں انکے مطابق اس کی خوشحالی کے لیے کوشش کرے، کوئی دوسرا اسکی سیاسی فلاح کا شعبہ سنبھالے اور دنیا میں جن طریقوں سے قومیں اپنی سیاسی تنظیم کیا کرتی ہیں انہی میں سے کسی طریقہ کو اختیار کر کے اسے منظم کر ڈالے، کوئی تیسرا اسکی اخلاقی فلاح کا شعبہ سنبھالے اور پکارنا شروع کرے کہ آؤ بھائیو اسلام کی طرف۔ پس آپکے نزدیک اسلام اس قوم کی خدمت کے مختلف محکموں میں سے ایک محکمہ ہے اور دوسرے محکموں کے ساتھ بغیر کسی تصادم کے یہ اسی طرح چل سکتا ہے کہ دوسرے محکموں میں جن اصول، جن طریقوں اور جس لیڈر شپ کے تحت کام ہو رہا ہے ان سے یہ کوئی تعرض نہ کرے اور بس اپنے نماز روزے سے غرض رکھے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ لفظ مسلمان اگر کوئی معنی رکھتا ہے تو اس معنی کے لحاظ سے اسلام مسلمانوں کی زندگی کا ایک ڈیپارٹمنٹ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کو انکی زندگی کے تمام شعبوں پر فرمانروا ہونا چاہیے۔ ان کی سیاست، انکی معیشت، ان کی تعلیم، ان کے اخلاق، ان کے اندرونی معاملات اور خارجی تعلقات سب اسلام کے ماتحت ہونے چاہییں۔ دین کی ہدایت اور دین ہی کا ضابطہ ہو جو انکی زندگی کے مختلف شعبوں کو چلائے۔ انکی سیاست دین کی رہنمائی میں چلے، دوسری قوموں اور طاقتوں کے ساتھ انکے معاملات دین کی رہنمائی میں انجام پائیں، انکی ساری جدوجہد دین کے نصب العین کیلیے ہو، اور انکا کوئی قدم اُس راہ سے ہٹ کر نہ اٹھے جو دین نے انکے لیے متعین کی ہے۔ یہ تخیل رکھنے کی وجہ سے میں بالکل مجبور ہوں کہ ہر اس طرزِ عمل کی مخالفت کروں جو مسلمانوں کو مجرد ایک گروہ اشخاص سمجھ کر اختیار کیا جائے۔ م

توڑنا یا کم کرنا چاہتے ہیں تو آپ اسلام اور مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچاتے ہیں۔ اگر ان سیاسی جماعتوں کا ایک متعین مقصد ہے تو ان سے یہ کہنا کہ تم کوئی دوسرا مقصد کیوں پورا نہیں کرتیں ایسا ہی ہے جیسا کہ اگر کوئی جماعت مسلمانوں کی تعلیم کا کام اپنے ذمہ لے اور اس سے کہا جائے کہ تم مسلمانوں کی اقتصادی حالت کیوں درست نہیں کرتیں۔ یا کوئی جماعت مسلمانوں کی اقتصادی حالت کی درستی کا کام کرنے کیلئے اٹھے اس سے کہا جائے کہ تم مسلمانوں کے مذہبی عقائد کی اصلاح کیوں نہیں کرتیں اور جو بدعات مسلمانوں میں رائج ہو گئی ہیں ان کا استیصال کیوں نہیں کرتیں۔ مودودی صاحب نے مسلمانوں کے نصب العین کی بحث چھیڑ کر مسلمانوں کو موجودہ سیاسی جماعتوں سے دور رکھنے کی کوشش تو ضرور کی مگر حسب عادت مسلمانوں کو یہ نہیں بتایا کہ اگر مسلمان ان سیاسی جماعتوں کی شرکت سے احتراز کریں تو آخر موجودہ سیاسی جنگ کے متعلق کیا طریقہ کار اختیار کریں۔

(۱) آیا وہ انگریز یا ہندو اکثریت کے ساتھ اشتراک عمل کریں یا ان کے ساتھ عدم تعاون کی پالیسی اختیار کریں۔

(۲) آیا ملک میں جو کانسٹی ٹیوشن اس وقت جاری ہے یا آئندہ جاری ہو اس میں مسلمان کوئی حصہ لیں یا اس میں حصہ لینے سے احتراز کریں اور حکومت جیسی کچھ بھی اس وقت جاری ہے یا آئندہ جاری ہو اس پر غیر مسلموں کو قابض ہو جانے دیں اور مسلمانوں کا اس حکومت میں کوئی حصہ نہ ہو[1]۔

---

[1] خان بہادر صاحب نے میری کتاب کے جو اقتباسات خود اپنے اس مضمون کی ابتدا میں پیش فرمائے ہیں انکے اندر ان سوالات کا جواب موجود ہے مگر جو تخیلات انکے ذہن پر مسلط ہیں انکی وجہ سے وہ کوئی جواب ان عبارتوں میں نہ پا سکے اور ساری داستان سن کر آخر میں پوچھا تو یہ پوچھا کہ زلیخا مرد تھی یا عورت تھا۔ حضرت! میری پوزیشن یہ ہے کہ قرآن کی طرف سے ایک پیغام تمام انسانوں کے لیے میرے سپرد کیا گیا ہے اور اس پیغام کو مجھے ہندو، انگریز، جرمن، روسی، ہر ایک کے سامنے (بقیہ صفحہ ۱۲۰ پر)

(۳) کانگریسی خیال کے مسلمانوں کا جو مسلک ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل کر کے ہندوستان کی آئندہ حکومت قایم ہونا چاہیے یا مسلم لیگ کی جو پاکستانی اسکیم ہے ظاہر ہے کہ یہ دونوں اسکیمیں مولانا مودودی صاحب کے نزدیک مردود و مبغوض ہیں تو ان کی بجائے کونسی اسکیم مولانا مودودی صاحب پیش کرتے ہیں؟ وہ اسکیم ضروری تفصیل کے ساتھ عام فہم الفاظ میں پبلک کے سامنے پیش کریں تاکہ عام مسلمان اسکو سمجھ سکیں اور اگر وہ قابلِ عمل ہے تو اس کو اختیار کر سکیں۔ اس قسم کی مبہم اپیلوں سے کہ جو کچھ جاتا ہے جانے دو، سیدنا مسیح کے بقول "جبہ جاتا ہے تو کرتا بھی چھوڑ دینے کے لیے تیار ہو جاؤ تب ہی خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو سکیگی" تو کام چلتا نہیں نہ عوام کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا کریں اور کیا نہ کریں[1]۔ اس قسم کی ہدایت اور رہنمائی کا تو سوائے اسکے کوئی اور نتیجہ نہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۹) پیش کرتا ہے۔ میرے لیے ہندوستان میں برطانوی دستور، اور جرمنی میں نیشنل سوشلسٹ دستور، اور روس میں اشتراکی دستور، سب کی ایک ہی حیثیت ہے۔ میں سب کو غلط سمجھتا ہوں۔ ان دستوروں کے تحت جو نظام حکومت بنتے ہیں وہ میرے نزدیک خنزیر کی طرح حرام ہیں۔ اس حرام چیز پر اگر غیر مسلم قابض ہو جائیں تو ہو جائیں۔ غیر مسلم ہونے کی حیثیت سے یہ حرام چیز ہے ہی ان کے لیے۔ میرا کوئی مفاد اس سے وابستہ نہیں ہے۔ میں تو ان سب کو حاکمیت رب العالمین کی طرف دعوت دونگا اور ان سے کہونگا کہ اس بغاوت سے باز آؤ جو اپنے خدا سے تم کر رہے ہو، تمہاری اپنی فلاح اس میں ہے کہ اپنے بنائے ہوئے یہ سب کانسٹی ٹیوشن توڑ دو اور خدا کا بنایا ہوا کانسٹی ٹیوشن قبول کرو۔ اگر میری بات مانو گے تو سعادت دنیوی و اخروی سے ہمکنار ہو گے، اور نہیں مانتے تو اِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ۔ م

[1] جس کتاب میں یہ "مبہم اپیل" کی گئی ہے اسی میں چند صفحات آگے چل کر پوری اسکیم بھی اپنی ضروری تفصیلات کے ساتھ پیش کر دی گئی ہے۔ مگر خان بہادر صاحب کی عادت یہ ہے کہ جس چیز کو قبول نہیں کرنا چاہتے اسکے وجود ہی سے انکار کر دیا کرتے ہیں۔ اس طرح بحث بھی مختصر ہو جاتی ہے اور فریق مخالف کو الزام دینے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ م

ہوسکتا کہ مسلمان مسلم لیگ اور دیگر سیاسی جماعتوں سے بدظن ہو کر ان سے اشتراک عمل ترک کردیں اور پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں۔

(۴) جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں مولانا مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ اسلام کی راہ راست کے اجزاء یہ ہیں۔

(۱) انسان کو بالعموم اللہ کی حاکمیت و اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنے کی دعوت دی جائے۔

(۲) دوسرا جزیہ ہے کہ جتھا صرف ان لوگوں کا بنایا جائے جو اس دعوت کو جان کر اور سمجھ کر قبول کریں۔

(۳) تیسرا جزء یہ ہے کہ براہ راست غیر الٰہی نظام اطاعت پر حملہ کیا جائے۔

راہ راست کے متعلق یہاں تک جو کچھ مولانا نے بیان فرمایا وہ تو صاف ہے[۱]۔ مگر اُسکا آگے کا حصہ مولانا نے بالکل مبہم چھوڑ دیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ جتھا جو مولانا کی تجویز کے مطابق بنایا جائیگا اُسکا تعلق موجودہ کانسٹی ٹیوشن یا نظام حکومت سے یا آئندہ جو کانسٹی ٹیوشن بھی ملک میں قائم ہو اس سے کچھ ہوگا یا نہیں[۲]؟ موجودہ کانسٹی ٹیوشن جو اب تک قائم ہے یا آئندہ جو کانسٹی ٹیوشن قائم ہو اس میں یہ جتھا کوئی حصہ لیگا یا نہیں؟ اگر لیگا تو ظاہر ہے یا تو اس طریقہ پر لیگا جسکے مؤید کانگریسی مسلمان ہیں یعنی یہ کہ مولانا کا یہ جتھا غیر مسلموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کر کے کوئی نیا نظام حکومت قائم کرے۔ یا یہ جتھا مسلم لیگ کی پاکستانی اسکیم اختیار کرے۔ اس صورت میں مولانا کے اس جتھے کے سامنے اکثریت اور اقلیت، فوج میں اور سرکاری ملازمتوں میں اور انتخابی مجالس میں اپنی نمائندگی کے متعلق وہ سب سوالات آجائینگے جن سے مولانا مودودی صاحب مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان کلی اجتناب و احتراز کرنے

---

[۱] الحمد للہ کہ ایک بات تو صاف ہوئی۔ م

[۲] جی ہاں، دشمنی، مخالفت اور تخریب کا تعلق ہوگا۔ ہم اس سے تعاون نہیں کرینگے بلکہ اسے بدلنے کی کوشش کرینگے۔ م

کی ہدایت فرماتے ہیں۔

اگر یہ مولانا کا جتھا موجودہ نظام حکومت یا کانسٹی ٹیوشن میں یا اس نظام حکومت یا کانسٹی ٹیوشن میں جو آئندہ قائم ہو کوئی حصہ نہیں لیگا تو کیا یہ جتھا اس نظامِ حکومت سے جو ملک میں قائم ہو علیحدہ رہکر کام کریگا؟ اس صورت میں ظاہر ہے کہ اس جتھے کو ملک کے نظام حکومت میں کوئی دخل نہ ہوگا مگر اس کے ساتھ اس جتھے کو ملک کے نظام حکومت کا ماتحت اور محکوم ہو کر رہنا پڑیگا اس وقت تک جب تک کہ یہ جتھا ملک کے کل نظام حکومت کو ترغیب کے ذریعہ سے اپنا ہم خیال نہ بنالے یا تشدد کے ذریعہ سے نہ الٹ دے اور خود اس نظام حکومت پر بلا شرکت غیرے قابض نہ ہو جائے۔ مگر جب تک یہ جتھا ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا اس وقت تک اس جتھے کے تعلقات ملک کے نظام حکومت کے ساتھ کیا ہونگے؟ آیا اس جتھے کے افراد ملک کے قائم شدہ نظام حکومت کو ٹیکس دیا کرینگے یا نہیں؟ اور آیا اس جتھے کے افراد ملک کے مروجہ قانون کی پابندی کرینگے یا نہیں[1]؟ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے تو ظاہر ہے کہ مولانا کا یہ جتھا ملک کے قائم شدہ نظامِ حکومت سے ہر قسم کا تعاون کرتا ہے لہٰذا اس جتھے کے طریقہ کار میں اور ان مسلمانوں کے طریقۂ کار میں جو غیر مسلموں کے ساتھ

[1] اگر کوئی شخص گندے پانی کے تالاب میں گر گیا ہو اور وہ اس سے نکلنا چاہے تو کیا کریگا؟ آیا وہ تیر کر نکلنے کے لیے اسی گندے پانی میں ہاتھ پاؤں ماریگا یا پاک پانی تلاش کریگا؟ اس دوران میں کہ وہ اس تالاب کے اندر گرا ہوا ہے وہ اپنے جسم کو گندگی لگنے دیگا یا نہیں؟ اگر وہ پانی اسکے کان، ناک اور منہ میں گھس جائے تو اس سے وہ کس طرح بچیگا؟ ان تمثیلی سوالات پر اگر خان بہادر صاحب غور کریں تو انکی سمجھ میں پوری بات آجائیگی۔ جو جماعت کسی بگڑے ہوئے نظام کو بدلنے کے لیے اٹھتی ہے، ابتداءً اسے اپنی ساری جد و جہد انہی بگڑے ہوئے حالات کے اندر کرنی پڑتی ہے اور بہت سی وہ چیزیں جنکو وہ اصولاً ناجائز سمجھتی ہے ، حالات کے جبر سے اس پر مسلط رہتی ہیں۔ انکو مجبوراً برداشت کرنیکے معنی اس نظام سے تعاون کرنیکے نہیں ہیں۔ وہ اپنی حد امکان تک اس نظام اور اسکی ہر چیز سے عدم تعاون اور عملاً جنگ کریگی، مگر جن چیزوں سے بچنا ناممکن ہوگا انہیں بادلِ ناخواستہ گوارا کریگی۔ —م

اشتراک عمل کر کے کوئی نظام حکومت بنانا چاہتے ہیں کوئی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ مولانا کا یہ جتھا ملک کے قائم شدہ نظام حکومت کے ساتھ بطور ایک محکوم کے تعاون کرتا ہے اور دوسرا گروہ اس کے ساتھ بطور ایک حکومت کے حصہ دار کے۔[1] اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے تو مولانا کے اس جتھے کی پالیسی قائم شدہ حکومت کے ساتھ خواہ وہ انگریزوں کی ہو یا ہندو اکثریت کی ہو وہی ہوگی جو کچھ عرصہ پہلے کانگریس کی تھی یا اب بھی ہے۔ مگر کانگریس نے عدم ادائے ٹیکس کا کبھی اعلان نہیں کیا نہ اس بات کا اعلان کیا کہ وہ ملک کے عام قوانین کی قانون شکنی کرینگے۔ مولانا کو اس کا اعلان بھی کرنا ہوگا کہ ان کے جتھے کے افراد ملک کے ٹیکس ادا کرینگے یا نہیں اور ملک کے قوانین مجریہ کی پابندی کرینگے یا نہیں۔ بہر حال اس باب میں مولانا کا جو طریقہ کار ہو اس کا مولانا کو صاف الفاظ میں اعلان فرما دینا چاہیے تاکہ جو کوئی بھی مولانا کے اس جتھے میں شامل ہونا چاہے وہ جان بوجھ کر شامل ہو۔ کسی مغالطہ کے تحت شامل نہ ہو۔[2]

اس وقت تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ مولانا مودودی صاحب کے اعتراضات کا جو ملک کی سیاسی جماعتوں پر انہوں نے کیے ہیں اجمالی جواب ہے۔ آئندہ جو کچھ مجھکو عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مولانا نے اپنے ان مضامین میں جو اپنے نظریات پیش کیے ہیں وہ کہاں تک صحیح ہیں۔ جیسا کہ میں

---

[1] یوں کہیے تا کہ گندے پانی کے تالاب میں ایک شخص اس لیے تیرتا ہے کہ اس سے نکلنے کے لیے اسی میں ہاتھ پاؤں مارنے بغیر چارہ نہیں ہے اور دوسرا اس لیے تیرتا ہے کہ اس کا ایک جزو بنکر رہنا چاہتا ہے اور اسی کی شناوری میں عمر بسر کرنے پر راضی ہے۔ م

[2] عجیب اتفاق ہے کہ خان بہادر صاحب ٹھیک وہی سوال کر رہے ہیں جو فریسیوں نے اپنے شاگردوں کو بھیج کر مسیح علیہ السلام سے دریافت کرایا تھا۔ تَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ کی اس سے بہتر تعبیر کیا ہوگی۔ میں خان بہادر صاحب کو اطمینان دلاتا ہوں کہ میرے جتھے میں جو لوگ بھی آ رہے ہیں وہ کسی مغالطہ میں مبتلا نہیں ہیں۔ ساری باتیں وہ خوب سمجھ رہے ہیں۔ رہے باہر کھڑے ہو کر پوچھنے والے حضرات، تو انہیں جواب دینے پر میں مکلف نہیں ہوں۔ م

اوپر عرض کر چکا ہوں مولانا مودودی صاحب نے جو تفسیر آیۃ کریمہ:

"هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ" کی کی ہے وہ یہ ہے کہ "دین" کا لفظ اس آیۃ کریمہ میں قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو زمانہ حال میں لفظ "اسٹیٹ" رکھتا ہے اور "دین حق" مولانا کے نزدیک یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کی، خود اپنے نفس کی، اور تمام مخلوقات کی بندگی اور اطاعت چھوڑ کر صرف اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے اور اسی کی بندگی و اطاعت اختیار کرے پس درحقیقت اللہ کا رسول اپنے بھیجنے والے کی طرف سے ایک ایسے "اسٹیٹ" کا نظام لے کر آیا ہے جس میں نہ تو انسان کی خود اختیاری کے لیے کوئی جگہ ہے، نہ انسان پر انسان کی حاکمیت کے لیے کوئی مقام، بلکہ حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ جو کچھ بھی ہے صرف اللہ کے لیے۔ پھر رسول کے بھیجنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اس نظام اطاعت (دین) اور اس قانون حیات (الہدی) کو پوری جنس دین پر غالب کر دے۔ یہ رسول کا مشن ہے اور رسول اس مشن کو پورا کرنے پر مامور ہے۔ بالفاظ دیگر انبیاء اور ان کی بعثت کا مقصد دنیا میں ایک خاص قسم کا نظام حکومت قائم کرنا ہے۔ غالباً مولانا سے پیشتر مفسرین میں سے کسی نے خواہ وہ متقدمین میں سے ہوں یا متاخرین میں سے آیت کریمہ کی یہ تفسیر نہیں کی ہے۔ نہ انبیاء علیہم السلام کے عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخاطبین اولین سے یہ مطالبہ کرتے ہوں کہ ہم ایک اسٹیٹ یا حکومت قائم کرنے آئے ہیں اور تم ہم کو ایک قسم کی اسٹیٹ قائم کر لینے دو۔[1]

[1] اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کے سمجھنے میں بہت سے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک کسی شخص کی نظر جدید نظریہ ریاست (Theory of State) پر نہ ہو اس کے لیے اس مضمون کا سمجھنا مشکل ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسٹیٹ محض اس انتظامی مشینری کا نام نہیں ہے جو اندرونی نظم مملکت کا تحفظ اور بیرونی حملوں کی مدافعت کرتی ہے،
(بقیہ صفحہ ۱۲۵ پر)

مثلاً (۱) لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (سورۃ الاعراف رکوع ۸)

(۲) وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (سورۃ الاعراف رکوع ۹)

(۳) وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (الاعراف رکوع ۱۰)

(بقیہ حاشیہ صـ۱۲۴) بلکہ آج کل کا اسٹیٹ درحقیقت پوری انسانی زندگی کا ٹھیک اسی طرح احاطہ کرتا ہے جس طرح مذہب کرتا ہے۔ اشتراکی اسٹیٹ ہو یا فاشستی یا جمہوری، ہر ایک کی بنیاد میں ایک خاص مابعد الطبیعی نظریہ ہے، ایک خاص تصور کائنات ہے، ایک خاص تصور انسان ہے، ایک خاص فلسفۂ اخلاق اور ایک خاص اجتماعی فلسفہ ہے پھر ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص فلسفہ کے لحاظ سے ایک مقتدر اعلیٰ کا تعین کرتا ہے (مثلاً قوم یا باشندگان ملک، یا کمیونٹی) جس کی نیابت وخلافت کسی ڈکٹیٹر، یا پارلیمنٹ یا پارٹی کے سپرد ہوتی ہے۔ پھر اسٹیٹ کے حدود میں رہنے والے تمام افراد سے اس مقتدر اعلیٰ کی حاکمیت تسلیم کرنے اور اسکی غیر محدود اطاعت کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ افراد کی زندگی اور بحیثیت مجموعی سوسائٹی کی زندگی کا کوئی شعبہ اسٹیٹ کی گرفت سے باہر نہیں ہوتا۔ اسٹیٹ ہی اپنے نظریات کے مطابق انکی تعلیم اور تعمیر سیرت کا ذمہ لیتا ہے، اسٹیٹ ہی اپنے فلسفۂ اخلاق کے مطابق ان کے لیے اخلاقی معیار مقرر کرتا ہے، اسٹیٹ ہی انکی زندگی کے لیے قوانین وضع کرتا ہے اور حلال وحرام کے حدود مقرر کرتا ہے، اور اسٹیٹ ہی یہ طے کرتا ہے کہ وہ اپنی سعی وجہد کن راہوں میں صرف کریں اور کن میں نہ کریں۔ اگرچہ اسٹیٹ کی یہی حقیقت ہر زمانہ میں تھی اور اسی بنا پر کہا گیا تھا کہ الناس علیٰ دین ملوکھم، مگر پہلے اس حقیقت پر پردہ پڑا ہوا تھا اور اب یہ بالکل کھل کر سامنے آگئی ہے اور تمام دنیا میں یہی نظریہ ریاست مسلّم ہو چکا ہے۔ اب غور کیجیے کہ دین اسکے سوا اور کس چیز کا نام ہے؟ ایک مابعد الطبیعی عقیدہ، ایک مقتدر اعلیٰ کا تصور

(بقیہ صـ۱۲۶ پر)

(۴) وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (الاعراف رکوع ۱۱)

(۵) الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ (ہود ۔ رکوع ۱)

ان آیات میں انبیاء کرام میں سے کسی نے اپنی قوم سے یہ نہیں کہا کہ ہم تمہارے درمیان اس واسطے آئے ہیں کہ تم میں ایک اسٹیٹ یا کوئی خاص قسم کا نظام حکومت قائم کریں۔ نہ اپنی قوم سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ ان کے مجوزہ نظام حکومت کو قبول کریں۔ جو کچھ بھی ان انبیاء علیہ السلام نے اپنی قوم سے مطالبہ کیا وہ صرف یہ تھا اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ۔ ظاہر ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۵) جس سے بالاتر کوئی اقتدار (Authority) نہ ہو، اس مقتدر اعلیٰ کی حاکمیت تسلیم کرنا اور اپنے آپکو اسکی اطاعت میں دیدینا، ایک فلسفۂ اخلاق و فلسفۂ اجتماع (Social philosophy) جس پر زندگی کا پورا نظام قائم ہو، ایک ہمہ گیر قانون جو تمام معاملات زندگی کا احاطہ کرلے، انہی چیزوں کے مجموعہ کا نام تو دین ہے۔ اسی بنا پر خود آجکل کے مغربی فلاسفہ و مفکرین بھی یہ کہنے لگے ہیں کہ موجودہ دور اسٹیٹ نے خدا اور مذہب کی جگہ لے لی ہے۔ فرق اگر کچھ ہے تو صرف اس حیثیت سے ہے کہ جو شخص ان ریاستوں میں سے کسی کی اطاعت کرتا ہے اور اسی کی اطاعت کے برحق ہونیکا اعتقاد بھی رکھتا ہے وہ مومن بغیر اللہ و مسلم لغیر اللہ ہے، اور جو ان کے برحق ہونیکا منکر اور اللہ کا معتقد ہے مگر انکی اطاعت پر راضی ہے وہ مومن باللہ و مسلم لغیر اللہ ہے۔ بخلاف اسکے انبیاء علیہم السلام جو دعوت لیکر آئے تھے وہ یہ تھی کہ لوگ مومن باللہ اور مسلم للہ ہو جائیں، اللہ ہی کو مقتدر اعلیٰ تسلیم کریں، اسی کی اطاعت قبول کریں اور انکی پوری زندگی پر وہی ہمہ گیر ضابطۂ اخلاق و قانونی محیط ہو جو اللہ نے مقرر کیا ہے۔

اس چیز کو میں جن الفاظ میں بیان کرتا ہوں، بلاشبہ وہ متقدمین کے ہاں کہیں نہ ملینگے، کیونکہ اُس وقت یہ الفاظ ان معانی کے ساتھ مستعمل نہ ہوتے تھے۔ مگر انصاف کے ساتھ دیکھیے کہ جس حقیقت کو میں بیان کر رہا ہوں، کیا وہی قرآن میں بیان نہیں ہوئی ہے اور کیا اسی کو تمام ائمۂ ہداۃ بیان نہیں کرتے چلے آرہے ہیں؟ ۔ م

کہ ان انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ وہ خدا سے اُسکے بندوں کا رشتہ جوڑیں اور ماسوا سے ان کا رشتہ توڑیں[1] اور اُن سے یہ مطالبہ کریں :-

کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق | زباں اور دل کی اطاعت کے لائق

لگاؤ تو لو اُس سے اپنی لگاؤ | جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

بلکہ ذیل کی آیتہ یعنی قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ دِیْنِیْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا (سورہ یونس رکوع ۱۱) سے

---

[1] افسوس یہ ہے کہ لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ تمام انبیاء نے یہی کہا ہے کہ اللہ ہی کو الٰہ اور رب (یعنی ہر حیثیت سے مقتدر اعلیٰ) تسلیم کرو، اسی کی بندگی اختیار کرو اور جو ضابطۂ اخلاق و قانون (نظام شریعت) ہم اسکی طرف سے لیکر آئے ہیں اسی کی پیروی کرو۔ پچھلے نوٹ میں ہیں نے اسٹیٹ کی جو تعریف بیان کی ہے اسکو سامنے رکھکر دیکھیے انبیاء علیہم السلام نے اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا عقیدہ، انسان کی طرف سے اسکی تسلیم و اطاعت، اور انسانی زندگی پر شریعت الٰہی کے نفاذ کا مطالبہ جو پیش کیا تھا وہ ایک الٰہی اسٹیٹ یا حکومت الٰہیہ کے قیام کی دعوت کے سوا اور کیا تھا؟ اگر خان بہادر صاحب اسکے قائل نہیں ہیں تو وہ مجھے بتائیں کہ انبیاء آخر یہ شریعتیں لیکر کیوں آئے تھے؟ یہ حرام و حلال کے حدود کس لیے تھے؟ یہ دیوانی و فوجداری کے قوانین کیوں انہوں نے پیش کیے تھے؟ یہ مَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ، اور مَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى، اور اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ کا اعلان کیوں کیا جاتا تھا؟ اور ہر نبی یہ کیوں کہتا تھا کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ؟ کیا یہ شریعتیں اس حیثیت سے آئی تھیں کہ یہ بھی برحق ہوں اور انسانی ساخت کے قوانین بھی برحق ہوں اور انسان کے لیے یکساں جائز ہو کہ چاہے اِن کی پیروی کرے اور چاہے اُن کی؟ — م

دین حق کی جو تفسیر مولانا نے کی ہے اسکی بداہتاً تردید ہوتی ہے[1] اس آیتہ میں دین کے معنی اگر "اسٹیٹ" کے لیے جاویں تو وہ کسی طرح کھپ نہیں سکتے - کلام پاک کا قاعدہ ہے کہ اسکی ایک آیت دوسرے کی تفسیر کرتی ہے - اس سے ثابت ہوا کہ "دین حق" کی جو تفسیر مولانا نے کی ہے وہ صحیح نہیں ہے - وہ انبیاء علیہم السلام تو جنکا ذکر آیات ۱ تا ۴ میں ہوا ہے غالباً ایسی اقوام کی طرف مبعوث ہوئے تھے جن کا کوئی سربرآوردہ بادشاہ نہیں تھا - لیکن جن قوموں میں سربرآوردہ بادشاہ موجود تھے انکی طرف بھی جو انبیا مبعوث ہوئے انہوں نے بھی ان بادشاہوں سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم اپنی گدی خالی کردو ہم تمہاری جگہ دوسرا انظام حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں[2] - چنانچہ وَقَالَ مُوسٰى یٰفِرْعَوْنُ اِنِّیْ رَسُوْلٌ

[1] تردید نہیں بلکہ اسکی تائید ہوتی ہے - آیت کا ترجمہ مع تشریح یہ ہے :-

"(اے نبی) کہو کہ لوگو! اگر تم میرے دین کی طرف سے شک میں ہو (یعنی اگر تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میں کس دین کا متبع ہوں) تو سن لو کہ) میں انکی بندگی نہیں کرتا جنکی تم اللہ کے سوا بندگی کرتے ہو، بلکہ میں اللہ کی بندگی کرتا ہوں جو تم کو وفات دیتا ہے (یعنی جسکے قبضہ قدرت میں تم سب کی زندگی و موت ہے) اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنوں میں سے ہوں (یعنی اسی اللہ پر ایمان لانے والوں میں سے ہو جاؤں) اور یہ کہ سب طرف سے منہ موڑ کر اپنا رُخ اسی الدّین (یعنی حقیقی و فطری دین) پر جماؤ"۔

پچھلے دونوں حاشیوں کو پیش نظر رکھ کر دیکھیے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے یہ آیت اسکی تائید کر رہی ہے یا تردید - تمام خرابی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ لوگوں نے عبادت کو محض پوجا اور پرستش کے معنی میں محدود کر دیا ہے اور اطاعتِ قانون کے مفہوم کو اس سے بالکل خارج سمجھ رکھا ہے اسی لیے وہ سمجھتے ہیں کہ بس اللہ کی پوجا کر لینے سے دین حق کا مدعا پورا ہو جاتا ہے، اور اسکے بعد اگر ساری زندگی غیر اللہ کے قانون کی اطاعت میں بسر ہو جائے تو اس سے دین میں کوئی رخنہ نہیں پڑتا - م

[2] آنکھ کھول کر قرآن نہ دیکھیے اور یہ چیز نہ ملے تو اس میں قصور آپ کا ہے یا کسی اور کا؟ کیا قرآن میں آپکو یہ آیت نہیں ملی کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لیے کہ اسکی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے)؟ اور کیا آپ نے سورۂ شعراء نہیں پڑھی جس میں ہر نبی اگر یہی کہتا ہے کہ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ (پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو)؟ - م

مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (الاعراف رکوع ۱۳) اسی سورۃ الاعراف میں کئی رکوع تک موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ بیان کیا گیا ہے مگر اس دوران میں موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا جو مقصد خاص مولانا مودودی صاحب کی تفسیر کے مطابق تھا یعنی ایک خاص نظام حکومت کا قیام اسکا کہیں ذکر تک نہیں آتا در آنحالیکہ اگر موسیٰ علی نبینا علیہ السلام کی بعثت کا اصل منشا کسی خاص نظام حکومت کا قیام ہوتا تو سب سے پہلے اسی کی تبلیغ فرماتے[1]۔ اگر کسی نظام حکومت کا قیام انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد قرار دیا جائے

---

[1] حضرت موسیٰ کا واحد مشن صرف یہی نہ تھا کہ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے چھڑائیں بلکہ یہ بھی تھا کہ فرعون کو اللہ کی اطاعت اور اذن الٰہی کے تحت اپنی اطاعت کی طرف دعوت دیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا (المزمل - ۱)	ہم نے تمہاری طرف رسول بھیجا ہے جو تم پر شاہد ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔ پھر جب فرعون نے رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے اس کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑا۔
وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (الدخان - ۱)	ہم نے ان سے پہلے فرعون کی قوم کو آزمائش میں ڈالا تھا۔ انکے پاس ایک معزز رسول آیا اور اس نے کہا کہ اللہ کے بندوں کو میرے سپرد کرو میں تمہارے لیے امانت دار رسول ہوں، اور یہ کہ اللہ کے مقابلہ میں سر نہ اٹھاؤ میں تمہارے سامنے کھلی ہوئی حجت پیش کرتا ہوں۔

بعض لوگوں نے "اللہ کے بندوں کو میرے سپرد کرو" کا مطلب یہ لیا ہے کہ "بنی اسرائیل کو میرے سپرد کرو" حالانکہ الفاظ عام ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم "اللہ کے بندوں" سے صرف بنی اسرائیل مراد لیں۔ اگر حضرت موسیٰ نے صرف بنی اسرائیل کی

(بقیہ صفحہ ۱۳۰ پر)

تو ماننا پڑیگا کہ انبیاء علیہم السلام میں سے اکثر تو اپنے مشن میں بالکل ہی ناکام رہے اور بعض اگر کامیاب بھی ہوئے تو محض جزواً ۔ سب سے پیشتر ابو الانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہی کو لے لیجئے ۔ آپ اپنی صد سالہ زندگی کے دوران میں کوئی اسلامی حکومت قائم نہ فرما سکے ۔ بلکہ کفار کے ظلم و جور سے مجبور ہو کر ایک مقام سے دوسرے مقام کو ہجرت ہی فرماتے رہے ۔ عراق اور بابل کی سرزمین جب آپ پر تنگ ہوئی تو کنعان کی طرف ہجرت فرمائی اور وہاں سے حجاز کی سنگلاخ زمین کی طرف گئے جہاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۹) رہائی کا مطالبہ فرمایا تھا تو فرعون کو بار بار یہ خطرہ ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ:

اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى (طٰہٰ ۱۳) اے موسیٰ کیا تم ہمیں ہماری زمین سے اپنے جادو کے بل پر نکالنے آئے ہو؟

کیوں وہ اپنی قوم کے لوگوں سے کہتا تھا کہ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ (المومن ۳) مجھے خوف ہے کہ یہ تمہارا دین بدل ڈالیگا یا زمین میں بدامنی پھیلا دیگا۔

اور کیوں اسکی قوم کے سردار کہتے تھے: اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى (طٰہٰ ۳) یہ دونوں (موسیٰ و ہرون) تو جادوگر ہیں چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے بل پر تم کو تمہاری زمین سے بے دخل کر دیں اور تمہارے طریقہ کو جو مثالی (آئیڈیل) ہے، ختم کر دیں۔

اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ (یونس ۸) کیا تو اسلیے آیا ہے کہ ہم کو اس طریقہ سے ہٹا دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور یہ کہ زمین میں تم دونوں بھائیوں کی بڑائی ہو؟

یہ سب آیات اس بات پر شاہد ہیں کہ حضرت موسیٰ کی اولین دعوت سرزمین مصر کے نظام اطاعت کو تبدیل کرنے کی طرف تھی، اور جب اس دعوت کو رد کر دیا گیا تو ان کا آخری مطالبہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو اس سرزمین سے نکل جانے دیا جائے ۔ م

ب ۵ اگر انسانوں کا انبیاء کی دعوت کو قبول نہ کرنا انبیاء کی ناکامی ہے تو فی الواقع بہت سے انبیاء ناکام رہے ۔ لیکن قرآن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ دراصل انبیاء کی ناکامی نہیں ہے بلکہ ان نالائق انسانوں کی ناکامی ہے جنہوں نے اپنے خیر خواہوں کی دعوت نہ قبول کی اور اس راستہ کو نہ اختیار کیا جس میں خود ان کی فلاح تھی ۔ م

آپ نے اور آپکے صاحبزادے سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام نے خدا کے سب سے پہلے گھر کی بنیاد ڈالی۔ مگر وہاں بھی آپکی حیثیت کسی فاتح یا کسی منظم اسلامی حکومت کے ہیڈ یا سردار کی نہیں تھی بلکہ ایک مہاجر اور خدا کے پیغام کے مبلغ ہی کی تھی۔ وہاں بھی جو آپ دعا فرماتے ہیں وہ یہی ہے کہ اِنِّیْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ۔

اگر آیۃ کریمہ کی اس تفسیر کو کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بعثت کا یہ مقصد تھا کہ وہ اسلامی حکومت کو جملہ غیر اسلامی حکومتوں پر غالب کر دیں صحیح مانا جائے تو ماننا پڑیگا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اسی طرح سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام اگرچہ بنی اسرائیل کو فرعون اور مصریوں کی غلامی سے آزاد کرانے میں کامیاب ہوئے لیکن وہ بنی اسرائیل کو چالیس سال تک فلسطین کے ریگستانوں میں لیے لیے پھرتے رہے اور وعدہ کی زمین یعنی بیت المقدس تک پہونچنے سے پیشتر انتقال فرما گئے اور کوئی معتد بہ اسلامی حکومت قائم نہیں کی۔ سیدنا مسیح علیہ السلام تو اس باب میں بالکل ہی ناکام رہے[1]۔

ہمارے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ضرور اپنے وصال سے پہلے عرب میں اسلامی حکومت

[1] ساری غلطی کامیابی و ناکامی کا مفہوم متعین کرنے ہی میں واقع ہو رہی ہے۔ اگر کوئی شخص شراب پی کر اپنی صحت اور اپنے اخلاق کو برباد کر رہا ہے اور میں خود اسکی بھلائی کے لیے اسے پرہیزگاری کی نصیحت کرتا ہوں اور وہ نہیں مانتا تو یہ میری ناکامی ہے یا اسکی؟ اگر آپ کہتے ہیں کہ تم سمجھانے میں ناکام ہوئے اسلیے یہ تمہاری ناکامی ہے، تو میں مان لیتا ہوں کہ اس معنی میں میں ناکام رہا۔ مگر اس ناکامی سے آخر مجھ پر کیا حرف آیا؟ سمجھانے کا حق ادا کرنے میں میں نے کوتاہی کی ہو تو بے شک یہ میرا قصور ہوگا۔ لیکن اگر میں نے پورا پورا حقِ نصیحت ادا کر دیا اور پھر اسکی اصلاح میں مجھے کامیابی نہ ہوئی تو ایسی ناکامی سے میرے اوپر کوئی الزام نہیں آتا، نہ یہ ناکامی میرے لیے باعثِ عار ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی ناکامی اسی نوعیت کی ہے۔ م

قائم کرنے میں کامیاب ہوئے مگر اس حکومت کا اقتدار بھی حضور کے وصال تک جزیرۃ العرب سے باہر نہیں پھیلا تھا اس لیے حضور اقدس بھی مولانا مودودی کی تفسیر کے مطابق "دین حق" یا اسلامی حکومت یا خدا کی بادشاہت کو پوری جنس دین پر یا غیر مسلموں کی حکومتوں پر غالب کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے[1] - یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ حضور ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے مگر حضور کے بعد حضور کے خلفائے راشدین اور حضور کی امت ایسا کرنے میں کامیاب ہوئی مگر اول تو یہ واقعہ نہیں ہے دوسرے یہ کہ خداوند عالم اپنے کلام پاک میں فرما چکا ہے۔

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا"

جسکے معنی ہیں کہ دین حق حضور کی حیات ہی میں کامل ہو چکا[2] اسلیے اسکی تکمیل جو حضور کے وصال کے بعد ہوئی ہو کوئی معنی نہیں رکھتی - نیز خلفائے راشدین کے زمانہ میں اگرچہ اسلامی حکومت ایشیاء اور افریقہ کے بہت بڑے حصہ میں پھیل گئی مگر پھر بھی یہ کہنا کہ وہ دنیا کی جملہ غیر مسلم حکومتوں پر غالب ہو گئی واقعہ کے خلاف ہے کیونکہ قریب قریب کل یورپ، افریقہ کا بڑا حصہ، چین، جاپان، ہندوستان، یہ سب ممالک اسکے حلقہ اثر سے باہر رہے - لیکن اگر آیۃ کریمہ کا یہ مطلب لیا جائے کہ حضور کی بعثت کا منشاء

[1] جس طرح آپ استدلال فرما رہے ہیں اس طریقہ سے تو آپ دین کا جو معنی بھی متعین کریں گے اسی معنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو ناکام ثابت کیا جاسکتا ہے۔ اگر دین بمعنی مذہب یا دھرم لے لیا جائے تو کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں یا آپکے بعد دین اسلام کے سوا سارے دھرم مٹ گئے؟ اس وقت تک کفر کے پیرو اسلام کے پیروؤں سے پانچ گنے زیادہ ہیں۔ پھر لیظہرہ علی الدین کلہ کے لحاظ سے تو آپ یہی کہینگے نا کہ حضور جس کام کے لیے بھیجے گئے تھے وہ کام نہ آپنے پورا کیا نہ آپ کی امت نے۔ دراصل یہ آپ کے طرز فکر کی غلطی ہے۔ آپ اپنا کامیابی و ناکامی کا معیار بدل دیں تو الجھن رفع ہو جائیگی۔ م

[2] دین کی تکمیل کا مفہوم یہ ہے کہ دین حق کے جتنے پہلو ہیں، روحانی، اخلاقی، تہذیبی، تمدنی، سیاسی، قانونی، غرض سب علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے واضح ہو گئے۔ م

یہ تھا کہ خدا کا پیغام اسکے بندوں تک پہونچا دیا جاوے تو یہ مشن باحسن الوجوہ پورا ہوا اور اب بھی بعونہ تعالیٰ پورا ہو رہا ہے - اس وقت دُنیا کا کوئی گوشہ نہیں ہے خواہ چین ہو یا جاپان، روس ہو یا جرمنی، امریکہ ہو یا آسٹریلیا، ملایا، سماٹرا، جاوا ہو یا فلپائن، جہاں وہ پیغام جو نبی امی روحی فداہ آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے مکہ کی سنگلاخ زمین سے لیکر اٹھا تھا نہ پہونچ گیا ہو اور آجکل کے ترقی شدہ ذرائع رسل رسائل نے اس پیغام کی اشاعت کو اور بھی عام کر دیا ہے - یہ ضرور ہے کہ جب نبی کوئی پیغام لیکر آتا ہے اور اسکے مخاطبین اولین کا کوئی گروہ اس پیغام کو قبول کرتا ہے تو ان کو اپنی ایک حکومت قائم کرنیکی ضرورت پڑتی ہے اور وہ اپنی حکومت اسلامی طریقہ پر قائم کرتے ہیں، مگر اس حکومت کا قیام ایک ضمنی بات ہے، اس نبی کی بعثت کا اصلی مقصد نہیں ہے[1]

[1] کس قدر ڈھیلی ڈھالی گفتگو ہے جس میں قائل خود نہیں سوچتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں - آخر نبی وہ کس قسم کا پیغام لاتا ہے جسکے قبول کرنے والوں کو اپنی حکومت ضرور قائم کرنی پڑتی ہے؟ اگر نبی کا پیغام صرف یہ ہے کہ اللہ کی پوجا کرو تو اس پیغام کے لیے اپنی حکومت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ "وہ حکومت اسلامی طریقہ پر قائم کرتے ہیں"۔ اگر نبی کوئی نظام حکومت قائم کرنے نہ آیا تھا، نہ اس نے کوئی نظام پیش کیا، نہ وہ نظام حکومت اس پیغام کا کوئی جزء تھا تو یہ "اسلامی طریقہ کی حکومت" کہاں سے آگئی؟ اور اگر ایک نظام حکومت بھی اس نے پیش کیا تھا اور وہ اس کے پیغام کا ایک جزء تھا تو اسکا قیام مقصدِ بعثت سے خارج اور ایک ضمنی چیز کیسے ہو گیا؟ کیا اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو جو پیغام دیتا ہے اس کا کوئی حصہ اختیاری (optional) بھی ہوتا ہے یا محض ضمیمہ کے طور پر ساتھ لگا دیا جاتا ہے کہ جی چاہے تو اسکے لیے کوشش کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے؟ پھر اگر نبی کوئی نظام حکومت پیش کرتا ہے تو آیا اسکی حیثیت یہ ہوتی ہے کہ یہ نظام بھی برحق ہے اور اسکے خلاف کوئی دوسرا نظام ہو تو وہ بھی برحق ہے، یا اسکی یہ حیثیت ہوتی ہے کہ یہی ایک برحق نظام حکومت ہے اور اسکے خلاف جو نظام ہے وہ باطل ہے؟ اگر آپ پہلی بات کے قائل ہیں تو گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام کی حکومت اور کفر کی حکومت دونوں یکساں ہیں؛ اور اگر آپ دوسری بات کے قائل ہیں تو براہ کرم اچھی طرح غور کرکے بتائیے کہ حکومتِ اسلام اور حکومتِ کفر کے درمیان بنیادی

(بقیہ صفحہ ۱۳۴ پر)

خدا کی بادشاہت زمین پر قائم کرنا یہ ایک دوسرا نظریہ یا اصطلاح ہے جسکے ذریعہ سے مولانا مودودی صاحب مسلمان پبلک کو مسلمانوں کی موجودہ سیاسی جماعتوں کی طرف سے بدظن کرنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ اس نظریہ یا اس اصطلاح کے لیے اسلامی لٹریچر سے مولانا نے کوئی سند پیش نہیں کی۔ زمین پر خدا کی بادشاہت والی اصطلاح اگر مولانا نے لی ہے تو اسی مغربی اور عیسائی لٹریچر سے لی ہے جسکی برائی کرنے سے مولانا مودودی صاحب کی زبان کبھی نہیں تھکتی۔ جس کسی کو بھی عیسائیوں کے مذہبی لٹریچر سے کچھ بھی واقفیت ہے وہ جانتا ہے کہ عیسائی دُنیا میں ذیل کی اصطلاحات عام طور پر رائج ہیں۔

۱۔ خدا کی بادشاہت آسمان پر۔ God's Kingdom in Heaven

۲۔ خدا کی بادشاہت زمین پر۔ God's Kingdom on Earth

لہذا مولانا کی مندرجہ بالا اصطلاح عیسائیوں کی اصطلاح نمبر ۲ کا لفظی ترجمہ ہے۔ اگرچہ میرے خیال میں مولانا نے عیسائیوں کی اس اصطلاح کا مفہوم بھی غلط سمجھا ہے[۵]۔ یہ نظریہ کہ ہم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۴) فرق کیا ہے اور ایک کے برحق اور دوسرے کے باطل ہونے کی اصولی توجیہ آپ کس طرح کرینگے؟ کاش خان بہادر صاحب نے ان باتوں پر غور کیا ہوتا تو انکی سمجھ میں خود یہ بات آجاتی کہ حکومت اسلامی کا بنیادی نظریہ اسلام کے عقیدۂ توحید و رسالت سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور یہ چیز ضمنی نہیں ہے بلکہ اساسی اہمیت رکھتی ہے۔ لا الٰہ کی نفی میں ہی حاکمیت غیر اللہ کا انکار اور الا اللہ کے اثبات ہی میں حاکمیت اللہ کا اقرار شامل ہے اور یہ بنیاد ہے اسلامی حکومت کی۔ م

۵؎ خان بہادر صاحب نے ان چند سطروں میں غلط فہمیوں کا ایک جنگل پیش کیا ہے وہ پہلے تو "مغربی" اور "مسیحی" کو ایک چیز قرار دے لیتے ہیں پھر یہ فرض کرتے ہیں کہ میں نے جتنی مخالفت مغربیت کی کی ہے وہ دراصل مسیحیت کی مخالفت ہے، پھر یہ قیاس قائم کرتے ہیں کہ "وہ زمین پر خدا کی بادشاہت" جس کا ذکر مسیحی لٹریچر میں آیا ہے وہ ایک غلط چیز ہے کیونکہ وہ مسیحی لٹریچر میں آیا ہے، پھر اہل مغرب نے ان الفاظ کا جو مفہوم متعین کیا ہے اسکو صحیح تسلیم کرکے مجھے الزام دیتے ہیں کہ تو نے ان الفاظ کا مطلب غلط سمجھا (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۵ پر)

زمین پر خدا کی بادشاہت یا حکومت الٰہیہ قائم کرنے کے لیے مامور ہیں دو باتوں کو مستلزم ہے[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۴) حالانکہ یہ سب آنجناب کی اپنی غلط فہمیاں ہیں۔ مغربی اور مسیحی دونوں ایک چیز نہیں ہیں، دو مختلف چیزیں ہیں۔ میں نے جتنی نکتہ چینی مغربیت پر کی ہے وہ ساری کی ساری آپ سے آپ مسیحیت پر چسپاں نہیں ہو جاتی۔ مسیحیت کے لٹریچر میں کسی چیز کا پایا جانا اس چیز کے غلط ہونے کو ہرگز مستلزم نہیں ہے۔ مسیحی مذہب بہرحال ایک پیغمبر جلیل القدر کی تعلیم سے ماخوذ ہے۔ اس میں خواہ کتنی ہی تحریف ہوئی ہو، مگر پھر بھی کچھ چیزیں اصلی بھی موجود ہیں، اور اگر وہ قرآن کے مطابق ہوں تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ سیدنا مسیح نے ہی ان باتوں کی تعلیم دی ہوگی۔ "خدا کی بادشاہت" کا جو مفہوم اہل مغرب نے سمجھا ہے دراصل وہی غلط ہے کیونکہ وہ اس سے مراد آسمانی بادشاہت لیتے ہیں، اور میں جو مفہوم لے رہا ہوں وہ صحیح ہے کیونکہ مسیح خود فرماتے ہیں: "تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو" اس سلسلہ میں اگر کوئی شخص میری کتاب مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم کا آخری حصہ پڑھ لے تو کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے۔

اب رہا یہ سوال کہ "زمین پر خدا کی بادشاہت" کا تخیل اسلامی ہے یا غیر اسلامی تو اس پر کسی لمبی چوڑی بحث کی یہاں ضرورت نہیں۔ خان بہادر صاحب نے آگے چل کر خود تسلیم کیا ہے کہ اسلام خلافت الٰہیہ کا نظریہ پیش کرتا ہے اور وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ مسلم حکمراں کی حیثیت خلیفہ کی ہے۔ اس کے بعد صرف سمجھ کا پھیر باقی رہ جاتا ہے، ورنہ بات بغیر کسی دقت کے سمجھی جا سکتی ہے۔ جب مسلم حکمراں خلیفہ یعنی نائب ہے تو وہ بادشاہ کون ہے جس کی وہ نیابت کر رہا ہے؟ خدا یا کوئی اور؟ اگر ہم زمین میں خلافت قائم کریں گے تو بادشاہت کس کی ہوگی؟ خدا کی یا کسی اور کی؟ ۔ م

[1] اس مقام سے لے کر آئندہ کئی صفحوں تک خان بہادر صاحب نے جو بحث فرمائی ہے وہ ساری کی ساری ایک عظیم الشان غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ محض امر تکوینی اور امر تشریعی کا فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے وہ اس بھول بھلیاں میں پڑ گئے ہیں، اور مصیبت یہ ہے کہ وہ مطالعہ و تحقیق کے بغیر اس قسم کے مسائل پر قلم اٹھانے کی جرأت کرتے ہیں۔ میں نے رسالہ دینیات کے پہلے باب میں اور اپنے مضمون "سلامتی کا راستہ" میں اور اسی سال ماہ ربیع الاول کے اشارات میں اس مسئلہ کو پوری طرح واضح کر دیا ہے اور دستور جماعت اسلامی میں تو اس کی اتنی توضیح کر دی گئی ہے کہ کسی شک کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ ۔ م

(۱) اول یہ کہ پہلے سے زمین پر خدا کی بادشاہت یا حکومت قائم نہ ہو جب ہی تو ہم اس کو قائم کرینگے۔

(۲) دوئم یہ کہ ہم خدا کی یہ حکومت اپنے سوا کسی دوسری مخلوق پر قائم کریں مثلاً ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں آئی اور اس نے برٹش کراؤن کی حکومت ہندوستان پر قائم کی۔ ظاہر ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایسا کرنے سے پیشتر برٹش کراؤن کی حکومت ہندوستان پر قائم نہیں تھی نیز یہ کہ وہ حکومت ہم ہندوستانیوں پر قائم کی گئی جو برٹش کراؤن اور ایسٹ انڈیا کمپنی دونوں سے جدا تھے۔

لیکن کیا یہ واقعہ ہے کہ بحر و بر زمین و آسمان سورج چاند تارے یا اس عالم شہود میں کوئی بھی ایسی چیز ہے یا ہو سکتی ہے جو خداوند ذوالجلال کی حکومت اور بادشاہت سے باہر ہو؟ اس عالم وجود میں جو کچھ بھی ہے آب و آتش، شجر و حجر، زمین و آسمان وہ سب طوعاً و کرہاً اس قادر مطلق کی حکومت کو مانتے ہیں اور اسکے سامنے سر بسجود ہیں۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۔ (النحل۔ رکوع ۶)

ونیز وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ طَوْعًا وَّكَرْهًا الخ (سورہ الرعد رکوع ۲)

یہ خیال کہ ہم انسان خدا کی حکومت اس زمین پر قائم کر سکتے ہیں دراصل شرک فی القدرت کے مترادف ہوگا جو دراصل کفر ہے۔ اور پھر ہم خدا کی حکومت قائم کرینگے تو کس پر؟ (۱) شجر پر یا حجر پر؟ آب پر یا باد پر؟ برق پر یا رعد پر؟ (۲) یا خود اپنے اوپر؟ اول الذکر تو خود پہلے ہی سے اس کے مطیع و منقاد ہیں پھر ہم ان پر حکومت اللہ کیا قائم کرینگے۔ ان سب چیزوں کو تو پہلے ہی سے خداوند عالم نے ہمارے لیے مسخر کر رکھا ہے، جب ہی تو ہم ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اٹھاتے ہیں۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند   تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہرِ تو سرگشتہ و فرماں بردار شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرماں نہ بری

اگر ان فطرت کی قوتوں کو خداوندِ عالم نے ہمارے وجود میں آنے سے پیشتر ہی ہمارے لیے مسخر نہ فرما دیا ہوتا تو ہمارا اس عالمِ آب و گل میں ایک دم کے لیے زندہ رہنا محال ہو جاتا۔ رہا خود اپنے اوپر حکومتِ الٰہیہ قائم کرنا تو وہ بھی پہلے ہی سے قائم و ثابت ہے۔ ہمارا مرنا جینا یہاں تک کہ سانس لینا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ جو سانس کہ باہر آتی ہے وہ مفرح ذات ہے اور جو اندر جاتی ہے وہ ممد حیات۔ مگر اس سانس کا اندر جانا اور باہر آنا یہ سب ہمارے اختیار سے باہر ہے ہم غذا کھاتے ہیں۔ پانی پیتے ہیں۔ یہ غذا جزو بدن بنکر خون صالح پیدا کرتی ہے جس سے ہماری زندگی قائم رہتی ہے۔ مگر غذا کا معدہ میں جا کر ہضم ہونا اور اس سے خون صالح کا پیدا ہونا یہ سب بغیر ہمارے ارادہ اور اختیار کے ہوتا رہتا ہے۔

لہٰذا حکومت الٰہیہ تو زمین و آسمان پر پہلے ہی سے قائم اور دائم ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو عالم کا یہ سب کارخانہ ایک لمحہ میں درہم برہم ہو جائے۔ ایسی حالت میں ہمارا زمین پر حکومت الٰہیہ قائم کرنا بالکل بے معنی ہے۔

دراصل اسلامی نظریہ یہ نہیں ہے کہ ہم زمین پر حکومت الٰہیہ قائم کرنے آئے ہیں اور انبیاء علیہم السلام اسی لیے مبعوث ہوئے تھے بلکہ اسلامی نظریہ یہ ہے کہ ہم زمین پر خلیفۃ اللہ ہیں اور ہم اس بات کے لیے مامور ہیں کہ ہم خود اپنے درمیان اور تمام دوسری مخلوق کے ساتھ جو اس زمین پر موجود ہے ایسا عمل اور برتاؤ کریں جو خلیفۃ اللہ کے لیے سزاوار ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام اگر مبعوث ہوئے تو صرف اسلیے کہ ہمکو یاد دلائیں کہ ہم خلیفۃ اللہ ہیں اور ہمکو خلیفۃ اللہ کے شایان عمل اور برتاؤ کرنیکے ضروری اصول سکھا دیں اور ان اصول کا برتنا اور ان سے فروع کا استنباط خود ہماری عقل اور وجدانِ صحیح پر چھوڑ دیں۔ اسی ہماری عقل اور ہمارے ذاتی علم کی بنا پر دجبکے حصول کے لیے

ہم مامور ہیں) خداوند عالم نے ہم کو اپنا خلیفہ اور مسجود ملائکہ بنایا اور اسی کی بناء پر ہم جزا و سزا کے مستوجب بنے ۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۔ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۔ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۝ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۝
(سورہ بقرہ ۔ رکوع ۔ ۴)

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

جب ہم اپنے اس خلیفۃ اللہ والے پوزیشن ( ) یا مرتبہ سے گر جاتے ہیں اور ہم میں خصائل رذیلہ پیدا ہوجاتے ہیں اس وقت انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوتے ہیں تاکہ ہم کو ہماری ذلت کی حالت سے نکال کر پھر اوجِ رفعت پر پہنچادیں ۔ ہماری فرشتوں پر برتری کی اگر کوئی وجہ تھی تو صرف یہی کہ ہمکو حقائق اشیاء کے علم سے سرفراز فرمایا گیا تھا جو فرشتوں کو بھی حاصل نہیں تھا۔ اب اگر ہماری ذلت کی کوئی وجہ ہوسکتی ہے تو صرف یہ کہ ہم نے مظاہرِ قدرت کا علم حاصل کرنا اور فطرت کی قوتوں پر قابو پانا جسکے لیے ہم خداوند عالم کی طرف سے مامور تھے اور جسکی بناء پر ہمکو خلافت ملی تھی اور مسجود ملائکہ بنے تھے چھوڑ دیا ۔ خدا کی آیات بینات جو عالم میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں ان پر غور کرنا

اور خدا کے کلام میں تدبر اور تفقہ کرنا چھوڑ دیا - اور تقلید جامد کو اپنا شیوہ بنا کر ارباباً من دون اللہ کی پرستش شروع کر دی تو لازمی نتیجہ ہوا کہ ہم اس علم سے محروم ہو گئے جو ہماری وجہ امتیاز تھا - لہٰذا ہم اپنے منصب جلیلہ سے گرا دیے گئے -

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو میں کہہ رہا تھا وہ یہ تھا کہ ہم اسکے لیے مامور نہیں ہیں کہ زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کریں (وہ تو قائم اور دائم ہی ہے خواہ کوئی اپنی کج فہمی سے سمجھے یا نہ سمجھے) بلکہ ہم اس دنیا میں خلافت الٰہیہ قائم کرنے آئے ہیں اور اس پر مامور ہیں کہ اس کو اس طریقہ پر قائم کریں جو ایک خلیفۃ اللہ کے سزاوار ہو - اور وہ خلیفۃ اللہ اس خلافت کو ان ضروری امور کی روشنی میں جو اسکو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے پہونچے ہیں خود قائم کریگا اور وہ خلافت خواہ شاہنشاہیت کی صورت میں ہو یا ڈکٹیٹرشپ کی صورت میں یا جمہوریت کی صورت میں وہ اسی خلیفۃ اللہ کی حکومت ہوگی[1] - اور اسی وجہ سے یہ خلیفۃ اللہ مستوجب جزا و سزا کا ہوگا کہ آیا اس نے یہ حکومت حق کی بنیادوں

---

[1] آخر اس کلام بلا فکر کی کوئی حد بھی ہے - "خلافت الٰہیہ" کا لفظ خود بول رہے ہیں اور پھر نہیں سمجھتے کہ اسی لفظ میں خدا کی بادشاہت کا مفہوم موجود ہے - پھر خود ہی پہلے کہہ چکے ہیں کہ کوئی نظام حکومت قائم کرنا انبیاء کے مشن میں شامل نہ تھا اور اب یہاں ارشاد ہوا ہے کہ ہم خلافت الٰہیہ قائم کرنے پر "مامور" ہیں - اسکے بعد سب سے زیادہ عجیب بات یہ ارشاد ہوتی ہے کہ "خلافت خواہ شہنشاہیت کی صورت میں ہو یا ڈکٹیٹرشپ کی صورت میں یا جمہوریت کی صورت میں وہ اسی خلیفۃ اللہ کی حکومت ہوگی" معلوم ہوا کہ حضرت خلافت کے لغوی معنی تک سے ناواقف ہیں کجا کہ قرآنی اصطلاح ہونے کی حیثیت سے اسکی روح کو سمجھیں - انکو معلوم نہیں کہ خلیفہ کہتے ہی اسکو ہیں جو خود مالک نہ ہو بلکہ مالک کی طرف سے اسکے نائب کی حیثیت میں کام کرے ، اور اس مفہوم کے لحاظ سے خلافت صرف اس حکومت کو کہہ سکتے ہیں جو اس واضح تصور پر قائم ہو کہ مالک الملک ، شہنشاہ اور آمر اللہ ہے اور حکومت کا نظام چلانے والے لوگ صرف اسکا امر شرعی نافذ کرنے والے ایجنٹ ہیں ، اور انہیں اصل مالک کو اس امانت کا حساب دینا ہے - پھر بھلا اس سے زیادہ جہل اور

(بقیہ صفحہ ۱۴۰ پر)

پر قائم کی یا باطل کی بنیادوں پر۔ دیکھنا ہوگا کہ اس خلیفۃ اللہ کی اس حکومت میں فرمانِ خداوندی - ان اللہ یامرکم بالعدل والاحسان و ایتاءِ ذی القربی وینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون (سورۂ نحل رکوع -۱۲) کی کہاں تک تعمیل ہوتی ہے - اور اسی جامع ومانع معیار سے جو اس آیۃ کریمہ میں مذکور ہے (اور غالباً اسی بناء پر آیۃ کریمہ کو خلیفہ راشد حضرت عمر ابن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے خطبہ جمعہ کے آخر میں درج فرمایا) دیکھنا ہوگا کہ جو حکومتیں اس خلیفۃ اللہ نے مختلف زمانوں میں قائم کیں وہ کہاں تک اس معیار پر پوری اترتی ہیں - انسان کی قائم کردہ حکومتوں کی بابت خواہ وہ زمانہ سابق کی ہوں خواہ زمانہ حال کی خواہ وہ جمہوری ہوں یا شاہنشاہی یہ کہنا کہ وہ بالکل طاغوتی حکومتیں ہیں جیسا کہ مودودی صاحب کا دعویٰ معلوم ہوتا ہے کسی طرح صحیح نہیں ہے[1] - ضرورت ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۹) کیا بات ہوگی کہ خلافت کے لیے جمہوریت اور ڈکٹیٹرشپ اور شہنشاہیت سب کو بطور ایک قالب کے تجویز کیا جائے درانحالیکہ یہ تینوں چیزیں اپنی روح، اپنے بنیادی اصول، حتیٰ کہ اپنے لفظی مفہوم تک کے اعتبار سے خلافت سے بالکل مختلف نوعیت کی چیزیں ہیں - میں نے اپنے مضمون "اسلام کا نظریۂ سیاسی" میں اس مسئلہ کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ م

[1] اوپر سے خان بہادر صاحب خلیفۃ اللہ کا لفظ برابر انسان کے معنی میں استعمال کرتے چلے آرہے ہیں اور خلافت انسانی کے مختلف مراتب کے درمیان فرق و امتیاز کا کوئی لحاظ انہوں نے نہیں کیا ہے - اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں پہنچ کر پھر انہوں نے ایک زبردست ٹھوکر کھائی - بلاشبہ انسان کا پیدائشی منصب خلیفہ ہی کا ہے، لیکن آگے چل کر تمام انسان دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں - ایک وہ جو خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اپنے منصب کو سمجھیں، مالک کی طرف سے جو حکم شرعی انکی طرف بھیجا گیا ہو اس کے ماتحت ہو کر کام کریں، اور خلافت کی حد سے گذر کر خود مالک ہونے کے زعم میں مبتلا نہ ہوں - دوسرے وہ جو خلیفہ کی حیثیت سے کام کرنے کے بجائے خود مختار بن بیٹھیں اور اصل مالک کے حکم شرعی کو تسلیم کرنے کے بجائے خود اپنی شریعت جاری کریں - اصطلاحاً لفظ خلیفہ کا اطلاق صرف پہلے گروہ پر ہو سکتا ہے - رہا دوسرا گروہ تو وہ مقرر تو کیا گیا تھا خلیفہ ہی کی حیثیت سے مگر اب وہ باغی ہو گیا، اسکے "بالکل طاغوت" ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی، اور اب اسکے کسی کام کو خلیفہ کا کام نہیں کہا جا سکتا - خان بہادر صاحب اس پوزیشن کو یوں اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ جب وہ سلطنت برطانیہ کے کسی (بقیہ صفحہ ۱۴۱ پر)

کہ ان سب حکومتوں کو معیار مندرجہ بالا پر جانچا جاوے - جہاں تک وہ اس معیار کو پورا کرتی ہیں، جہاں تک ان میں عدل ہے، احسان ہے، ایتاء ذی القربی پر عمل ہے، اور فحشاء و منکر اور بغی سے اجتناب ہے، وہاں تک وہ حق کی حکومتیں ہیں اور جہاں تک وہ اس معیار سے گری ہوئی ہیں اسی حد تک ان میں طاغوت کو دخل ہے[۱] - نیز یہ کہ خداوند عالم نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے اس خلیفۃ اللہ کو جو پیغام بھیجے اور اصولِ دین سکھائے اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ خلیفۃ اللہ اپنی عقل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۰) ضلع میں کلکٹر (یعنی خلیفہ برطانیہ) کی حیثیت سے کام کرتے تھے اُس وقت اگر وہ اپنے ضلع کی بادشاہی کا دعویٰ کر دیتے، یا ضلع کے باشندوں کی جمہوریت قائم کرکے خود صدر بن جاتے، اور انگریزی قانون کو رد کرکے اپنا یا ضلع کی پارلیمنٹ کا بنایا ہوا قانون جاری کر دیتے، اور ہندوستان میں تاج کی طرف سے جو افسر اسکے مامور ہے اسکی ماتحتی قبول کرنے سے انکار کر دیتے تو اس صورت میں انکی حیثیت کلکٹری کی باقی رہ جاتی یا یہ طرز عمل اختیار کرتے ہی وہ باغی و طاغی قرار پاتے؟ پھر جو خلیفۃ اللہ اپنے رب کے مقابلہ میں بعینہٖ یہی طرز عمل اختیار کرے، وہ کس طرح بدستور خلیفہ باقی رہ سکتا ہے اور اسکے طاغوت ہونے میں خان بہادر صاحب کو کیوں شک ہے؟ حقیقت میں اب وہ خلیفہ نہیں رہا بلکہ اب تو محض رب العالمین کے حلم و بردباری کے صدقہ میں اسے مہلت ملی ہوئی ہے - رب العالمین کے ملک میں اس باغی کے تمام تصرفات اب صرف اس وجہ سے ممکن ہو رہے ہیں کہ اسے ڈھیل دی جا رہی ہے، لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى - جونہی کہ یہ مہلت کی مدت پوری ہوئی، یکایک امر الٰہی کے تحت تمام عناصر کائنات نہیں محض کوئی ایک عنصر ہی ان باغی خلیفہ صاحب کے لیے مسخر ہونے سے انکار کر دیگا اور یہ اس طرح صفحۂ ہستی سے مٹینگے کہ نام و نشان تک باقی نہ رہیگا - م

[۱] یہ سراسر غلط بات ہے - تاج برطانیہ کے خلاف اگر آپ بغاوت کرکے اپنی آزاد حکومت قائم کر لیتے تو کیا سلطنت برطانیہ آپکے کاموں کو اس حیثیت سے جانچتی کہ آپکے کون سے کام برٹش لاء کے اصولوں کے مطابق ہیں اور کون سے اسکے خلاف؟ پھر آخر اللہ کے باغیوں کی حکومتوں کو آپ انکے کاموں کی تفصیلات کے لحاظ سے کہاں جانچنے چلے ہیں - باغی کا تو پورا کارخانہ بغاوت ہی بغاوت ہے - اس میں عدل و احسان کی تلاش کے کیا معنی؟ اسکا تو پورا کام ہی فحشاء و منکر و بغی ہو گیا - اب اس میں جزئی حیثیت سے یہ امتیاز نہیں ہو سکتا کہ اسکے فلاں حصے فحشاء و منکر و بغی ہیں اور فلاں نہیں ہیں - م

اور سمجھ سے کام لینا چھوڑ دے اور اپنے سب قوائے ذہنی کو معطل کر کے بیٹھ جائے۔ مثلاً آیۂ کریمہ متذکرۂ بالا میں خداوند عالم کی طرف سے عدل واحسان وایتاءِ ذی القربیٰ کا حکم دیا گیا اور منکر وغیرہ سے نہی فرمائی گئی ہے۔ مگر عدل، احسان، ایتاءِ ذی القربیٰ کی کوئی تعریف نہیں کی گئی، نہ فحشاء منکر و بغی کی کی گئی۔ لہٰذا عدل کیا چیز ہے، احسان کیا چیز ہے، منکر کس کو کہتے ہیں، بغی کس کو کہتے ہیں، یہ سب باتیں خلیفۃ اللہ کی اپنی عقل و سمجھ پر چھوڑ دی گئیں کہ وہ اپنی عقل و سمجھ کے ذریعہ سے انکی تعیین کرے[1]

اسی طرح اس خلیفۃ اللہ کو حکم ہوا کہ الامر شوریٰ بینکم۔ یہ اصول تو بتا دیا گیا مگر اس کی تصریح نہیں کی گئی کہ شوریٰ تم کس طرح کرو۔ شوریٰ کے ذریعہ سے جو حکومت تم قائم کرو وہ کیسے قائم کرو۔ وہ جمہوری ہو یا طبقاتی۔ ڈکٹیٹر شپ ہو یا شاہنشاہیت۔ یہ سب باتیں اسی خلیفہ کی رائے پر چھوڑ دیں[2] ورنہ اگر جملہ جزئیات کا ہر ہر شعبۂ زندگی کی بابت احصار شرع میں کر دیا جاتا تو اول تو لامتناہی تومار بن جاتا، دوسرے

---

[1] نعوذ باللہ من ذالک، اس سے بڑھ کر خلاف واقعہ بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ جو شخص قرآن و حدیث پر نظر رکھتا ہو کیا وہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اس غلط بیانی کو قبول کر سکتا ہے؟ اللہ اور اس کے رسول نے صرف یہی نہیں کہ ان تمام چیزوں کی حقیقت بالکل غیر مشکوک طور پر واضح کی ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک کے متعلق جزئی احکام تک دیئے ہیں، ہر ایک کی متعین عملی صورتیں بتائی ہیں، ایسی اصولی ہدایتیں دی ہیں جو غیر مصرح جزئیات میں بھی عدل یا احسان یا فحشاء و منکر کے وجوہ کا تعین کرنے میں ہماری پوری رہنمائی کرتی ہیں۔ چند جامع الفاظ میں ایک حکم دے کر ہم کو تاریکی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ نہیں دیا گیا ہے کہ مغربی فلاسفۂ اخلاق و قانون کی طرح منکر اور معروف، عدل و احسان اور ظلم و بغی کے تعین میں اٹکل پچو حکم لگاتے رہیں۔ م

[2] ہرگز نہیں۔ اگر آپ کو معلوم ہوتا کہ جمہوری، طبقاتی، ڈکٹیٹر شپ، اور شاہنشاہیت کے مفہومات کیا ہیں اور قرآن و حدیث پر بھی آپ کی نظر ہوتی تو آپ جان لیتے کہ اللہ اور اس کے رسول نے ان میں سے ہر ایک کی نفی کی ہے اور ان سب سے الگ خلافت کے بنیادی اصول پوری طرح بتا دیئے ہیں۔ نیز رسول اکرم اور آپ کے تربیت یافتہ ساتھیوں نے نظام خلافت کو عملاً چلا کر بتا دیا جس سے خلافت کی اسپرٹ اور طریق کار دونوں ہمیشہ کے لیے دوسرے تمام نظامات حکومت سے ممیز ہو گئے ہیں۔ م

یہ کہ پھر انسانی ذہن اور عقل معطل ہو کر رہ جاتیں جو یقیناً شارع اسلام کی منشاء کے خلاف ہے۔[1]

اوپر کی سطور میں مولانا مودودی صاحب کے صرف دو نظریوں سے یعنی مولانا کی دین حق کی تعبیر اور زمین پر خدا کی بادشاہت کا قیام والے نظریوں سے بحث کی گئی ہے۔ مولانا کے باقی نظریوں سے بحث کرنا میں اس سیاسی بحث میں بالکل غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ اگرچہ ان دونوں نظریوں کی بحث بھی موجودہ سیاسی کشمکش کی بحث میں بالکل غیر متعلق تھی۔ لیکن چونکہ مولانا نے ان مباحث کو چھیڑ کر مسلمانوں کو ملک کی سیاسی جماعتوں سے بدظن کرنا چاہا تھا اس لیے مولانا کے ان دونوں نظریات کی بابت کچھ نہ کچھ کہنا ناگزیر تھا۔[2]

اب جو کچھ عرض کرنا مجھ کو رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں آیندہ جو کچھ نظام حکومت بھی بنے اس میں مسلمانوں کا تعلق غیر مسلموں سے کیا ہوگا اور وہ اسلامی نقطۂ نظر سے کہاں تک جائز یا ناجائز ہوگا۔ کانگریسی خیال کے جو علماء یا مسلمان ہیں وہ تو آئندہ کے لیے ایسے نظام حکومت پر راضی ہیں جس میں صوبجات کی

---

[1] خدا اور رسول نے نہ تو انسانی ذہن و عقل کو بالکل معطل کیا ہے اور نہ اندھے بھینسے کی طرح تاریکی میں بھٹکتے پھرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ آپکو تو صرف جمود و تعطل سے بچنے کی فکر ہے، مگر اسلام جتنا اس سے بچانا چاہتا ہے اتنا ہی عقل کی بے راہ رویوں سے بھی بچانا چاہتا ہے۔ م

[2] اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھنے میں آپ نے جو ٹھوکریں کھائی ہیں اور ابھی کچھ مدت پہلے مسلم لیگ کے سرکاری اخبار نے انہی امور پر جو بے سروپا رائے زنی کی ہے اسکو دیکھتے ہوئے تو فی الواقع آپ لوگ بدظنی ہی کے مستحق ہیں۔ جس گروہ کی آپ اور ایڈیٹر منشور نمائندگی کرتے ہیں اسکے اکابر زعماء اور اسکے عام کارکنوں کا علم و فہم اسلام کے متعلق آپ دونوں حضرات سے بھی کم ہے، اور اس پر خوف خدا اور احساس ذمہ داری کی کمی کا یہ حال ہے کہ بہ نہایت جرأت کے ساتھ اس گروہ کا ہر شخص اسلام کی طرف جو چاہتا ہے کہتا ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ نہ جاننا اتنا بڑا عیب نہیں جتنا یہ ہے کہ آدمی نہ جاننے کے باوجود اپنے آپکو جاننے والا سمجھے اور ناقص معلومات کی بنیاد پر صرف رہروی ہی نہیں بلکہ رہبری تک کے لیے آمادہ ہو جائے۔ ایسے لوگوں سے کس طرح یہ حسن ظن قائم کیا جا سکتا ہے کہ عامۂ مسلمین کی قیادت اگر پوری طرح ان کے ہاتھوں میں آ جائے اور ان کا کامل اتباع کیا جانے لگے تو ترکی، ایران، عراق کے ارباب حل و عقد کی طرح یہ اپنے ملک کے مسلمانوں کی گمراہی کا سبب نہ بنیں گے۔ م

حکومتوں میں اور نیز مرکزی حکومت یا گورنمنٹ آف انڈیا میں ہندوؤں اور غیر مسلموں کی اکثریت ہو اور جو قوانین یہ حکومتیں بنائیں انکے ماتحت مسلمان زندگی بسر کریں۔ یہ ضرور ہے کہ اس صورت میں مسلمان اقلیت ہندو اکثریت سے اپنے مذہبی شعائر اور مذہبی قانون کے لیے خاص تحفظات حاصل کرلے گی تب وہ اس نظام پر راضی ہونگے۔

مسلم لیگ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو کچھ بھی وثائق ہندو اکثریت مسلمان اقلیت کے لیے ان کے مذہبی شعائر کی بابت دینے کے لیے تیار ہو جاوے اسکا کیا اطمینان ہو سکتا ہے کہ با اختیار بننے کے بعد ہندو اکثریت ان وثائق پر قائم رہیگی اور شعائر اسلام کو توڑنے اور ان کو نیست و نابود کرنے کی کوشش نہیں کریگی۔ اس لیے مسلم لیگ کی یہ تجویز ہے کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان کی علحدہ حکومتیں قائم کی جائیں اور یہ کسی مرکزی حکومت کی ماتحت نہ ہوں تاکہ کم از کم مسلمانوں کی اکثریت والے صوبوں میں مسلمان شعائر اسلامی کو قائم رکھ سکیں۔ وہ صوبے جن میں مسلمان اقلیت میں ہیں ان میں وہ اقلیت میں رہیں اور ہندو اکثریت کے ساتھ اشتراک عمل کر کے نظام حکومت قائم کریں۔ ان مسلمانوں کے لیے وہ خطرہ ضرور قائم رہتا ہے جو کُل مسلمانوں کے لیے ہوتا اگر کل ہندوستان کا ایک واحد نظام حکومت بنایا جاتا، مگر اس کا تحفظ کسی حد تک اس طرح ہو جاتا ہے کہ جب ملک میں کم از کم چار صوبے ایسے ہیں کہ جن میں مسلمان اکثریت میں ہیں تو وہ صوبے جن میں ہندو اکثریت میں ہیں مسلمان اقلیت کے ساتھ بالکل بیباکی اور بے خوفی کے ساتھ برا طریقہ عمل غالباً اختیار نہ کریںگے۔

بہر حال اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی اس سے زیادہ بہتر اور کوئی صورت مسلم لیگ کے ارباب حل و عقد کی سمجھ میں نہیں آئی۔ گو میں مسلم لیگ کی پاکستانی اسکیم کی تائید کرتا ہوں چونکہ میرے خیال میں مسلمانوں کی اکثریت اسکی موید ہے، مگر میری ذاتی اسکیم اس باب میں یہ ہے کہ موجودہ صوبوں میں سے جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں وہ اکثریت میں رہیں اور جہاں اقلیت

میں ہیں وہاں اقلیت میں رہیں اور ان سب صوبوں کو زیادہ سے زیادہ حکومت خود مختاری دی جائے
مگر مرکز کو بالکل ہی نہ اڑا دیا جاوے، بلکہ مرکز بھی قائم رہے - لیکن اس شرط کے ساتھ کہ مرکز میں قلیل
اقلیتوں مثلاً عیسائیوں، پارسیوں، سکھوں کو انکی آبادی کے تناسب سے نمایندگی دینے کے بعد باقی مرکز
کی نمائندگی مسلمانوں میں اور ہندؤوں میں برابر تقسیم کی جاوے - اس اسکیم کا یہ فائدہ ہے کہ مرکز میں
چونکہ نہ ہندؤوں کی اکثریت ہوگی نہ مسلمانوں کی تو مرکز نہ ان صوبوں پر جن میں مسلمانوں کی اکثریت
ہے ہندؤوں کے مفاد کے خلاف بے جا دباؤ ڈال سکیگا نہ مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ان صوبوں
پر جن میں ہندؤوں کی اکثریت ہے بے جا دباؤ ڈالا جا سکیگا - اس اسکیم کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ملک
چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں یا ریاستوں میں تقسیم نہیں ہو جاتا بلکہ اسکی موجودہ وحدت قائم رہتی ہے
اور پاکستانی اسکیم کے جو مفاد ہیں وہ بھی بحالہ قائم رہتے ہیں - اس اسکیم پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے
کہ مرکز کا ہیڈ یا پریزیڈنٹ اور ملک کی کل فوج کا کمانڈر انچیف بہرحال ایک ہی ہوا کریگا اور مسلمان اور
ہندو کبھی اس بات پر متفق نہیں ہونگے کہ وہ پریزیڈنٹ یا کمانڈر انچیف مسلمان ہو یا ہندو - یہ مشکل
کوئی ایسی مشکل نہیں جو قابل حل نہ ہو - مثلاً یہ مشکل اس طرح حل کی جا سکتی ہے کہ ہندو مسلمانوں میں یہ
طے ہو جاوے کہ مرکز کا یہ پریزیڈنٹ اور کمانڈر انچیف اگر ایک مرتبہ ہندو ہو تو دوسری مرتبہ
مسلمان اور جب پریزیڈنٹ ہندو ہو تو کمانڈر انچیف مسلمان ہو اور جب کمانڈر انچیف ہندو ہو تو پریزیڈنٹ
مسلمان - (مجھکو اس بات کے تسلیم کرنے میں کچھ بھی تامل نہیں ہے کہ میری یہ اسکیم مولانا مودودی
صاحب کی بین الاقوامی وفاق والی اسکیم سے بڑی حد تک ماخوذ ہے[1]) -

لہٰذا خواہ مسلم لیگ کی پاکستانی اسکیم اختیار کی جاوے یا میری مندرجہ بالا اسکیم، یہ واضح
رہے کہ مسلم اکثریت والے صوبوں میں بھی (یہ میں اپنے قیاس سے کہتا ہوں مسلم لیگ کا کوئی اعلان اس
بابت میرے پاس نہیں ہے اگرچہ اس قیاس کی صحت پر مجھکو یقین واثق ہے) حکومت جو قائم ہوگی

[1] یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کی قوموں کے درمیان منصفانہ تصفیہ (۱۴۵) کی جو تجویزیں سیاسی کشمکش حصہ دوم میں پیش کی تھی وہ خان بہادر صاحب

وہ خالص مسلمانوں کی حکومت نہیں ہوگی؎۱ اس میں غیر مسلم آبادی بھی شریک اور حصہ دار اُسی طرح ہوگی جیسے مسلم اقلیت والے صوبوں میں مسلم اقلیت غیر مسلم اکثریت کے ساتھ حکومت میں حصہ دار ہوگی۔ اس مسلم اکثریت کو اختیار رہوگا کہ جو نظام حکومت ان صوبوں میں قائم کیا جاوے وہ ایسا ہو کہ مسائل اسلامی میں غیر مسلم ارکان حکومت کو کوئی دخل نہ ہو۔ باقی مشترکہ مسائل کل کابینہ یا پارلیمنٹ کی رائے سے طے ہوں۔ جس سے یہ ظاہر ہے کہ خواہ مسلم اکثریت والے صوبے ہوں یا مسلم اقلیت والے صوبے خواہ مسلم لیگ والی اسکیم اختیار کی جاوے یا کانگریس والی ہر صورت میں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ آئندہ حکومت میں اشتراک عمل کرنا ہوگا۔

کیا مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل ناجائز ہے؟

لیکن کیا مسلمانوں کے لیے اس طرح غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل ناجائز ہے؟ یہ سوال میں نے اس لیے اٹھایا کہ علماء کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اس طرح کے اشتراک عمل کو مسلمانوں کے لیے ناجائز خیال کرتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلامی حکومت اگر قائم ہو تو وہ خالص اسلامی ہونا چاہیے۔ غیر مسلم اگر اس میں رہیں تو وہ بطور محکوموں اور ذمیوں کے رہیں۔ کسی ایسی حکومت کو وہ مسلمانوں کے لیے جائز نہیں سمجھتے جس میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی حکومت میں حصہ دار ہوں؎۲ نیز ان بزرگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ایک شخص باوجود جملہ مہمات دین پر ایمان لانے کے اس وقت تک کامل الایمان مسلمان نہیں ہوتا جب تک کہ وہ ایک خالص اسلامی

؎۱ اور ظاہر ہے کہ اس کا اسلامی حکومت ہونا اور بھی زیادہ بعید از امکان ہے۔ م

؎۲ مجبوری کے حالات میں محض ایک دور عبوری (Transitional period) کی حیثیت سے ایسے نظام حکومت کو گوارا کیا جا سکتا ہے جس کا آپ ذکر فرما رہے ہیں، بشرطیکہ اس میں مسلمانوں کو کم از کم وہ تہذیبی خود اختیاری Cultural autonomy حاصل ہو جس کو میں اپنی کتاب مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ دوم میں مفصلاً بیان کر چکا ہوں۔ لیکن یہ چیز مسلمان کا نصب العین نہیں بن سکتی۔ اسلام جو حکومت چاہتا ہے جس کی بنیاد خالص اسلامی نظریۂ سیاسی، اسلامی اصول اخلاق اور اسلامی قانون پر ہو۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی حکومت کو صرف اہل ایمان ہی چلا سکتے ہیں۔ م

حکومت نہ قائم کرلے یا اگر زمین پر کوئی خالص اسلامی حکومت پہلے سے قائم ہے تو وہ شخص اُس حکومت کی طرف ہجرت نہ کر جاوے یا اس کا ممبر نہ بن جاوے۔[1] جب ان بزرگوں کی خدمت میں یہ عرض کیا جاتا ہے کہ حضورؐ کے حکم سے مسلمانوں کے دو گروہ ہجرت کرکے حبشہ میں گئے جہاں کا بادشاہ اس وقت غیر مسلم عیسائی

۱؎ یہ مسئلہ کی بالکل غلط تعبیر ہے - کوئی یہ نہیں کہتا کہ "آدمی کامل الایمان نہیں ہوتا جب تک وہ خالص اسلامی حکومت قائم نہ کرلے" اور آخر کوئی مسلمان ایسا خیال کس طرح کر سکتا ہے جبکہ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر پیغمبروں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ، اور حضرت مسیحؑ اور حضرت یحییٰؑ جیسے انبیاء کرام نے پوری زندگی غیر اسلامی حکومتوں کے تحت گذاری - اگر انبیاء بھی کامل الایمان نہ ہونگے تو اور کون ہوگا - البتہ جو کچھ علماء حق کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمان کا دین اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ مومن باللہ اور مسلم للہ نہ ہوجائے۔ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے جس میں کوئی استثنا نہیں - اب اگر کوئی مومن اپنے ارادے کے بغیر کسی ایسی جگہ اپنے آپکو پاتا ہے جہاں غیر اللہ کا حکم جاری ہوتا ہو اور جہاں کے نظام تمدن و سیاست کا تقاضا یہ ہو کہ آدمی مسلم لغیر اللہ ہو کر رہے تو اس صورت میں مومن کی سخت آزمائش ہے - اگر وہ مسلم لغیر اللہ ہونے پر راضی اور مطمئن ہے اور اس صورت حال پر کوئی بے چینی تک اپنے دل میں محسوس نہیں کرتا تو اس کا مومن باللہ ہونا بھی سخت مشکوک ہے - اور اگر وہ اس صورتِ حال پر راضی تو نہیں ہے لیکن اسکو بدلنے کے لیے عملاً کوئی سعی و جہد بھی نہیں کرتا، نہ ہجرت ہی کرتا ہے تو وہ ناقص الایمان اور ظالمٌ لنفسہٖ قرار پاتا ہے - اور اگر وہ مسلم لغیر اللہ ہونے سے انکار کر دیتا ہے اور اس غیر الٰہی نظام تمدن و سیاست کو الٰہی نظام سے بدلنے کے لیے عملاً مجاہدہ کرتا ہے تو اس کا دین کامل اور اسکا ایمان بالکل سالم ہے خواہ وہ اس نظام کو بالفعل بدل دینے میں کامیاب ہو یا نہ ہو۔ اس آخری صورت میں اُسکا غیر مسلم حکومت کے اندر رہنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ مسلم لغیر اللہ ہے، بلکہ اسکی مثال اسیر جنگ کی سی ہے - اگر وہ اس حالت میں شریعت کے بعض احکام پر عمل کرنے سے مجبوراً قاصر رہتا ہے یا کفار کے بعض احکام کا اجراء مجبوراً اپنے اوپر برداشت کرتا ہے تو اسکے دین و ایمان پر کوئی حرف نہیں آتا - یہ تینوں صورتیں جو میں نے بیان کی ہیں، انکی تصریح قرآن میں موجود ہے - اور ان کے علاوہ ایک چوتھی صورت بھی ہے جسکا ذکر حدیث میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی جب اپنے گرد و پیش کفر و فسق کا غلبہ

(بقیہ صفحہ ۱۴۸ پر)

تھا اور اس کی حکومت میں یہ مسلمان رہے اور اس ملک کے قانون کی پابندی کی یا حضور[۴] کی ہجرت مدینہ سے پہلے کچھ مسلمان ہجرت کر کے مدینہ گئے اور وہاں جیسی کچھ بھی حکومت قائم تھی اسکے احکام کی پابندی ان مسلمانوں نے کی تو کیا یہ مسلمان کامل الایمان مسلمان نہیں تھے؟ تو اسکے جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ یہ صورت حضور کی ہجرت مدینہ اور آیاتِ جہاد کے نزول سے پہلے کی تھی۔ حضور کی ہجرت مدینہ کے بعد اور آیاتِ جہاد کے نزول کے بعد یہ سب صورتیں ناجائز ہیں[۵]۔ یہ سب ایسے سوالات ہیں کہ ان کی بابت علماء کو اپنی فیصلہ کن رائے دینا چاہیے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۷) دیکھے اور اپنے اندر اس حالت کو بدلنے کی طاقت نہ پائے تو اس سرزمین سے نکل کر جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف چلا جائے اور وہاں بکریوں کا دودھ اور درختوں کے پتے کھا کر زندگی گذار دے۔ ایسا شخص بھی کامل الایمان ہے۔ م

[۵] آپ نے شاید کسی کم علم آدمی کے سامنے اپنا یہ اعتراض پیش کیا ہوگا اور اُس بیچارے نے ناواقفیت کی بنا پر یہ بات بنائی ہوگی۔ درحقیقت آپکے اس اعتراض میں قیاس مع الفارق کا مغالطہ چھپا ہوا ہے جسکی طرف سطحی نظر رکھنے والوں کی نگاہ نہیں جاتی اسلیے وہ غریب کسی نہ کسی طرح پہلو بچا کر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ حبش کی طرف مسلمانوں کی ہجرت اور اسی طرح یثرب کی طرف ابتدائی ہجرت کو اس حالت پر قیاس کر رہے ہیں جس میں آپ خود اس وقت مبتلا ہیں۔ حالانکہ دونوں میں خواہ صوری مشابہت ہو مگر حقیقت اور جوہر کے اعتبار سے عظیم الشان فرق ہے۔ اُس وقت مسلمان اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور کفر کا غلبہ مٹا کر دینِ حق کا بول بالا کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے۔ اس حالت میں جب کفار کا ظلم و ستم انکی حدِ برداشت سے زیادہ ہو گیا تو انہوں نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑانی شروع کی کہ دنیا کے اس کفرستان میں کونسی ایسی جگہ ہے جہاں نسبتاً محفوظ و مامون ہو کر ہم اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد زیادہ کامیابی کے ساتھ کر سکتے ہوں۔ اس غرض کے لیے پہلے حبش پر انکی نظر گئی، چنانچہ وہ وہاں ہجرت کر کے گئے، اور بعد میں نجاشی کے رویہ نے ثابت کر دیا کہ ان کا انتخاب غلط نہ تھا۔ پھر اللہ نے یثرب کا اور بھی زیادہ بہتر موقع ان کے لیے پیدا کیا اور انہوں نے اُس سے فائدہ اٹھا کر اس مقام کو اپنی جدوجہد کے مرکز کی حیثیت سے منتخب کر لیا۔ کہاں یہ بات، اور کہاں یہ کہ آپ نہ تو کفار کو ایمان باللہ و اسلام للہ کی طرف دعوت دیں، نہ اس کا فراہ نظام تمدن و سیاست کو اسلامی نظام تمدن و سیاست

(بقیہ صفحہ ۱۴۹ پر)

راقم الحروف کی جو کچھ رائے اس باب میں ہے (اسکی جو کچھ بھی وقعت ہو) وہ ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے کہ جن احکام کے ماتحت مسلمان حبشہ کو ہجرت کر کے گئے اور وہاں ایک غیر مسلم حکومت کے ماتحت رہے یا جو مسلمان حضور کی ہجرت سے پہلے مدینہ کو ہجرت کر کے گئے اور ایک غیر مسلم نظام حکومت کے ماتحت رہے یا حضورؐ کے مدینہ کو ہجرت کر کے تشریف لے جانیکے بعد مسلمانوں میں اور مدینہ کے یہود میں معاہدہ ہوا اور اس معاہدہ کے مطابق کچھ عرصہ تک مدینہ کا نظام حکومت چلا[1] اور جسکو مسلمانوں نے نہیں بلکہ یہود نے توڑا، یہ سب احکام وقتی تھے۔ بلکہ یہ احکام اس لیے دیئے گئے تھے کہ شارع اسلام کے علم میں مسلمانوں کو ایسی ہی صورتیں آئندہ بھی پیش آنے والی تھیں اس لیے یہ احکام اور مسلمانوں کا اس وقت کا عمل اس لیے تھا کہ اس قسم کی آئندہ پیش آنے والی صورتوں میں مسلمانوں کے لیے شمع راہ کا کام دیں۔ مثلاً اگر اس وقت کسی مسلمان مبلغ کی تبلیغ کے اثر سے انگلینڈ یا جرمنی میں کچھ لوگ مسلمان ہوجاویں (جیسا کہ ہو رہے ہیں) اور سب مہمات دین پر ایمان لے آویں تو کیا وہ اس وقت تک

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴۸) سے بدلنے کے لیے جدوجہد کریں، نہ اس راہ میں کوئی تکلیف، کوئی نقصان، کوئی مصیبت اٹھائیں، بلکہ یہ سب کچھ کرنے کے بجائے کفرستان میں مزے سے زندگی بسر کریں اور اسی کافرانہ نظام کے اندر اپنے لیے اور زیادہ آرام دہ جگہ پیدا کرنے کے نقشے سوچیں۔ کیا پہلی حالت اور اس دوسری حالت میں فی الواقع کوئی مماثلت ہے کہ ایک کو دوسری کے لیے دلیل جواز بنایا جاسکے؟ م

[1] یہ بالکل غلط ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے معاہدہ کر کے کوئی مشترک نظام حکومت بنایا تھا جس کے تحت ابتداءً مدینہ کا انتظام رہا ہو۔ بلکہ واقعہ جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ حضورؐ نے مدینہ تشریف لے جاتے ہی انصار کی آبادی کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور خالص اسلامی حکومت کی بنا ڈال دی۔ پھر اس حکومت کی جانب سے یہودیوں کے ساتھ اس قسم کا ایک معاہدہ کیا جس میں ایک طرف بیرونی حملوں کے مقابلہ میں مشترک مدافعت کی شرائط تھیں اور دوسری طرف یہ طے کیا گیا تھا کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہمسائیگی کے تعلق کی بنا پر جو معاملات پیش آئینگے انکا تصفیہ کس طرح ہوگا۔ اس کی نوعیت دراصل دو خود مختار حکومتوں کے معاہدۂ دوستی و معاونت کی سی تھی نہ کہ ایک مشترک نظام حکومت کی۔ م

کامل الایمان مسلمان نہیں ہونگے جب تک کہ وہ انگلینڈ اور جرمنی کی موجودہ حکومتوں کو بدل کر ان ملکوں میں خالص اسلامی حکومتیں نہ قائم کردیں یا جب تک کہ وہ ان ممالک سے ترک سکونت یا ہجرت کر کے کسی ایسے مرکز میں جہاں خالص اسلامی حکومت ہو جو صحیح معنوں میں خلافتِ راشدہ کہلانے کی مستحق ہو (گو ہماری بدقسمتی سے اس وقت کوئی اسلامی حکومت بھی ایسی نہیں ہے جو صحیح معنوں میں خلافت راشدہ کہلانے کی مستحق ہو) نہ چلے آویں؟ لیکن اگر کوئی ایسا اسلامی مرکز موجود بھی ہوتا یا موجودہ اسلامی سلطنتوں میں سے کسی کو (مثلاً سعودی حکومت کو جو حجاز میں ہے) ہم ایسا مرکز مان بھی لیں تو کیا یہ قابل العمل پالیسی ہو سکتی تھی یا ہو سکتی ہے کہ چین، ہندوستان، ایران، ترکستان سب جگہ سے مسلمان ہجرت کر کے حجاز عرب میں چلے جاویں؟ اگر اس طرح ہجرت کرنا مسلمانوں پر لازم کر دیا جاوے تو وہ تکلیف مالا یطاق کے مترادف ہوگا۔[1]

یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ بہت افضل اور اعلیٰ ہے کہ وہ وحدت اسلامی قائم کرنے کی

[1] افسوس یہی ہے کہ آپ اس معاملہ میں نہ تو اسلامی احکام سے واقف ہیں، اور نہ کسی چیز کے قابلِ عمل ہونے یا کسی تکلیف کے مایطاق ہونے ہی کے متعلق آپکا معیار اسلامی معیار ہے۔ اسلام نے مسلمان کے لیے تین ہی صورتیں رکھی ہیں۔ یا تو وہ دار الکفر کو دار الاسلام بنانے کی کوشش کرے، یا دار الاسلام موجود ہو تو اسکی طرف ہجرت کر جائے، یا اگر دار الاسلام موجود نہ ہو تو جنگلوں کی طرف ہجرت کر کے اپنا ایمان بچائے۔ باقی رہی یہ صورت کہ دار الکفر میں اطمینان سے رہیے اور غیر اللہ کے قوانین پر زندگی بسر کیجیے، اور اسی ماحول میں نسلیں پیدا کیجیے جو کفر و الحاد کے عقیدے اور فسق و فجور کے اخلاق و خصائل لے کر اٹھیں، تو اسکا جواز کتاب و سنت میں تلاش کرنا فضول ہے۔ آپکے نزدیک پہلی تینوں صورتیں ناقابل عمل اور تکلیف مالایطاق ہیں، اور قابلِ عمل و مایطاق صرف آخری صورت ہی ہے۔ مگر آپکو معلوم نہیں کہ مومن کے لیے مرجانا قابلِ عمل اور مایطاق ہے اور یہ آخری صورت بالکل ناقابلِ عمل اور اسکی طاقتِ برداشت سے باہر ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک راستباز آدمی کے لیے فاقہ کرنا اور بھوکوں مرجانا آسان اور قابلِ برداشت ہے مگر چوری کرنا مشکل اور قطعی ناقابلِ برداشت۔ برعکس اسکے دوسرے لوگوں کے لیے واقعی فاقہ نہیں بلکہ صرف اسکا امکانی خطرہ ہی اس قدر ناقابل برداشت ہوتا ہے کہ وہ چوری کے قابل عمل طریقہ پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ آپ قابلِ عمل و ناقابلِ عمل اور مایطاق و مالایطاق کو متعین امور سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ اضافی و نسبی چیزیں ہیں — م

کوشش کریں اور جہاں تک ہو سکے ایک مرکز کے تابع بنیں، مگر جب ایسا کرنا عملاً ممکن نہ ہو اس صورت میں
مسلمانوں کے لیے ان سب طریقوں پر رہنا اور زندگی بسر کرنا بالکل جائز ہے جن مختلف طریقوں پر
مسلمانوں نے حضورِ اقدس کے زمانہ میں زندگی بسر کی۔ کیونکہ ہر زمانہ میں مسلمانوں کو ایسے مواقع بھی پیش آوینگے
اور آرہے ہیں کہ ان میں سے بعض ایسی جگہ ہوں جہاں اونکی مظلومی اور مقہوری کی حالت ہو اس لیے اگر وہاں
سے وہ بسلامت ہجرت کر کے نہیں جا سکتے تو انکو اس حالت میں اس قسم کی زندگی بسر کرنا ہوگی جس طرح
ہجرت نبوی سے پہلے مسلمانوں نے مکہ میں بسر کی۔ اسی طرح مسلمانوں کو ایسے مواقع بھی پیش آئینگے اور آرہے
ہیں کہ ان کو غیر اسلامی حکومتوں کے ماتحت زندگی بسر کرنا ہوگا (کیونکہ ایسے مقاموں سے کل مسلمانوں کا ہجرت
کر کے مرکز اسلام کی طرف چلا جانا ہر وقت قابل العمل نہیں ہے)۔ اس وقت انکو اس طرح زندگی بسر
کرنا ہوگی جیسی کہ مسلمانوں نے حبشہ میں بسر کی تھی۔ اسی طرح ایسی صورتیں بھی پیش آوینگی جیسی کہ آجکل
ہندوستان میں پیش ہیں جہاں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ رہ کر اور اشتراک عمل کر کے زندگی بسر کرنا ہوگی
جیسی کہ انہوں نے ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں مدینہ منورہ میں یہود کے ساتھ اشتراکِ عمل کر کے بسر کی۔[1]
اسی طرح مسلمانوں کو ایسے مواقع بھی پیش آوینگے جہاں ان کو جہاد فی سبیل اللہ کرنا ہوگا اور تن من دھن
کی بازی لگانا ہوگی۔ ایسے مواقع پر مسلمانوں کا جو عمل اور رویہ حضورِ انور کے زمانہ کے غزوات اور خلفائے
راشدین کے زمانہ کے غزوات میں تھا اسی کی پیروی مسلمانوں کو کرنی ہوگی۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ مسلمانوں کو اگر
تبلیغ کا کوئی موقع مل سکتا ہے تو وہ اسی صورت میں مل سکتا ہے کہ ان کو غیر مسلموں میں رہ کر ان کے درمیان

---

[1] افسوس ہے کہ آپ کی ساری تمثیلیں غلط ہیں۔ مکہ کی مثال اُس حالت میں چسپاں ہو سکتی ہے جب آپ اللہ کے راستہ کی طرف دعوت دیں
اور جواب میں پتھر کھائیں اور ریت پر گھسیٹے جائیں۔ ہجرت حبشہ کی مثال اُس حالت پر راست آسکتی ہے جب آپ راہِ
خدا میں جدوجہد کرتے ہوئے حبشہ جیسے کسی ملک کی طرف پسپا ہوں۔ اور مدینہ منورہ کے معاہدہ کی مثال اُس حالت پر صادق
آتی ہے جب آپکی جدوجہد اس منزل پر پہنچے کہ بین الاقوامی معاہدہ کرنا آپکے لیے ممکن ہو۔ م

زندگی بسر کرنے کی اجازت ہو۔ اگر مسلمانوں کو اس کی اجازت نہ ہو، اگر مسلمانوں کے لیے غیر مسلم حکومتوں کے ماتحت یا غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک کر کے ایک مشترکہ حکومت میں رہنا ناجائز ہے تو مسلمانوں کو کیسے موقع مل سکتا ہے کہ وہ غیر مسلموں میں تبلیغ کا کام کر سکیں؟[1] خلافت راشدہ اور اس کے بعد کی بنی امیہ اور عباسی خلافتوں کے زمانہ میں مسلمان غیر مسلم علاقوں میں اگر گئے تو ہمیشہ فاتح کی حیثیت ہی سے نہیں گئے۔ مشرقی ہند کے جزائر مثل سماٹرا، جاوا، بورنیو وغیرہ میں مسلمان کبھی فاتح کی حیثیت سے نہیں گئے۔ نہ مشرقی اور جنوبی چین میں مسلمان کبھی فاتح کی حیثیت سے گئے۔ ان ممالک میں جو مسلمانوں کی ہزاروں، لاکھوں بلکہ کروڑوں کی آبادی ہے یہ انہیں مسلمانوں کی مساعی جلیلہ کا نتیجہ ہے جو ان ممالک میں بحیثیت تاجر کے گئے اور وہیں بس گئے[2] اور اپنے اخلاق حمیدہ اور صفات ستودہ کا اپنے ماحول پر ایسا اثر ڈالا کہ اکثر مقامات کی کل کی کل آبادی مسلمان ہو گئی جیسا کہ مشرقی بحر ہند کے اکثر جزائر کا حال ہے۔ ہندوستان میں بھی جتنا کچھ بھی اسلام پھیلا وہ مسلمان بادشاہوں اور فاتحین کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ مسلمان مشائخ اور اہل دل کی مساعی کا

[1] غالباً یہ سب کچھ اس تخیل کے تحت ارشاد ہو رہا ہے کہ آپ کے نزدیک اسلام بھی عیسائیت یا بودھ مت کی طرح کا کوئی مذہب ہے، اور اسلام کی تبلیغ محض مشنریوں کے پرچار کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ حالانکہ اسلام انسانی زندگی کے پورے اعتقادی، اخلاقی، تمدنی، سیاسی، معاشی نظام کو بدل ڈالنا چاہتا ہے اور اس کی تبلیغ کی نوعیت مشنری کام کی سی نہیں بلکہ انقلابی جدوجہد کی سی ہے۔ اگر یہ پرخطر کام جناب کرنے کے لیے تیار ہوں تو غیر مسلموں کے درمیان رہنے اور غیر مسلم حکومتوں کے حدود میں قیام کرنے کے لیے آپ محض اجازت ہی مانگتے ہیں مگر میں اس کا حکم نکال کر دکھانے کے لیے تیار ہوں۔ - م

[2] مسلمانوں کو تجارت کے لیے یا دوسرے کاموں کے لیے دار الاسلام سے دار الکفر اور دار الحرب میں جانے کی اجازت ہے۔ مگر شاید آپ کو ان احکام فقہی کی خبر نہیں کہ دار الاسلام کی رعایا میں سے کسی شخص کو وہاں مستقل قیام کی اجازت نہیں ہے بلکہ ایک معین مدت کے اختتام پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ دار الاسلام کی طرف واپس آ جائے۔ نیز مسلمان کے لیے وہاں نسل کشی کو مکروہ ٹھیرایا گیا ہے کیونکہ اس میں یہ خطرہ ہے کہ مسلمان کی اولاد اہل کفر کے اخلاق پر اٹھیگی۔ بعد کے مسلمانوں نے اگر اس کے خلاف عمل کیا تو برا کیا۔ - م

نتیجہ ہے ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ممالک متوسط آگرہ اودھ جو اسلامی حکومت کا صدیوں تک گہوارہ رہے وہاں کی مسلمانوں کی آبادی ۱۵ فی صدی سے زائد نہیں ہے اور بنگال کی ۵۶ فی صدی ہے ۔ اس لیے مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ رہنا بسنا انکے ساتھ اشتراک عمل کرنا جائز ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہے ۔

صد شکر کچھ تو اُن سے ہوئی آج گفتگو
یہ اور بات ہے کہ حریفانہ ہوگئی

وما علینا الا البلاغ ۔

اعلان

مولانا کی مشہور تصنیف "تنقیحات" عرصہ چھ سات ماہ سے ختم ہو چکی تھی ۔ اور شائقین حضرات بے تابی سے اس کے دوبارہ طبع ہونے کا انتظار فرما رہے تھے ۔ الحمدللہ کہ اب یہ کتاب دوبارہ چھپ کر آگئی ہے اور جن حضرات کی فرمائشیں رجسٹر میں درج تھیں انکو بھیجی جارہی ہے ۔ چونکہ کاغذ کی بے حد گرانی کی وجہ سے یہ ایڈیشن صرف ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوا ہے لہذا قارئین کرام اور تاجران کتب جلد از جلد اپنی فرمائشیں بھیجدیں ۔ معلوم نہیں اس کے بعد تیسرا ایڈیشن چھپنے کا کب موقع آئے ۔ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے قیمت میں مجبوراً اضافہ کرنا پڑا ہے ۔ امید ہے کہ اسکو محسوس نہ کیا جائیگا ۔

قیمت بے جلد عہ ۔ مجلد عہ محصول ڈاک ۳ر خرچ وی ۔ پی ۳ر

ملنے کا پتہ

منیجر ۔ دفتر ترجمان القرآن ۔ لاہور

انسان کا معاشی مسئلہ اور اسکا اسلامی حل

موجودہ زمانہ میں ملکوں اور قوموں کے، اور بحیثیت مجموعی دنیا کے معاشی مسائل کو جو اہمیت دی جارہی ہے، شائد اس سے پہلے کم از کم نمایاں طور پر انکو اتنی اہمیت کبھی نہیں دی گئی "نمایاں طور پر" کا لفظ میں اسلیے استعمال کررہا ہوں کہ حقیقت میں تو انسان کی زندگی میں اُسکی معاش جس قدر اہمیت رکھتی ہے اُسکے لحاظ سے ہر زمانہ میں افراد، جماعتوں، قوموں، ملکوں، اور تمام انسانوں نے اسکی طرف بہر حال توجہ کی ہے، لیکن آج اس توجہ کو جس چیز نے زیادہ نمایاں کردیا ہے وہ معاشیات کے نام سے ایک باقاعدہ علم کا بڑی بڑی کتابوں، بھاری بھرکم اصطلاحوں، اور پرشوکت اداروں کے ساتھ موجود ہونا، اور ساتھ ہی ضروریات زندگی کی پیدائش، فراہمی، اور اکتساب کے طریقوں کا پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے چلے جانا ہے - ان اسباب سے آج معاشی مسائل پر بحث و گفتگو اور عالمانہ تحقیق کا وہ زور شور ہے کہ انکے آگے انسانی زندگی کے سارے مسائل دب کر رہ گئے ہیں - لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جس چیز پر دنیا بھر کی توجہات اس طرح مرکوز ہو گئی ہیں وہ بجائے سُلجھنے اور صاف ہونے کے اور زیادہ اُلجھتی اور متعابنتی چلی جاتی ہے - علم المعیشت کی موٹی موٹی اصطلاحوں نے اور ماہرین معاشیات کی عالمانہ موشگافیوں نے عام لوگوں کو اس قدر دہشت زدہ کردیا ہے کہ وہ غریب ان اعلیٰ درجہ کی فنی بحثوں کو سن کر اس طرح اپنے معاشی مسئلہ کی ہولناکی سے مرعوب اور اسکے حل کی تمام توقعات سے مایوس ہوجاتے ہیں جس طرح ایک بیمار کسی ڈاکٹر کی زبان سے اپنی بیماری کا کوئی موٹا سا لاطینی نام سُن کر ہول کھاجاتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ جب مجھے ایسی سخت بیماری لاحق ہوگئی ہے تو میری جان کا اب اللہ ہی حافظ ہے-

حالانکہ ان اصطلاحوں اور فنی بحثوں کا غلاف اتار کر سیدھے سادے فطری طریقے سے دیکھا جائے تو انسان کا معاشی مسئلہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے، اور اس مسئلے کے حل کی مختلف صورتیں جو دنیا میں اختیار کی گئی ہیں اُنکے مفید اور مضر پہلو بھی بغیر کسی دقت کے دیکھے جا سکتے ہیں، اور اسکے حل کی صحیح فطری صورت جو کچھ ہوسکتی ہے اسکے سمجھنے میں بھی کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔

اصطلاحات کے چکر اور فنی پیچیدگیوں کے طلسمات نے اس مسئلے کو جس قدر الجھایا ہے اُس پر مزید اُلجھن اس وجہ سے بھی پیدا ہو گئی ہے کہ انسان کے معاشی مسئلہ کو، جو دراصل انسانی زندگی کے عظیم تر مسئلہ کا ایک جز تھا، مجموعہ سے الگ کر کے بجائے خود ایک مستقل مسئلے کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا، اور رفتہ رفتہ یہ نے اتنی بڑھی کہ معاش کے مسئلے ہی کو پوری زندگی کا مسئلہ سمجھ لیا گیا۔ یہ پہلی غلطی سے بھی زیادہ بڑی غلطی ہے جسکی وجہ سے اس گتھی کا سلجھنا محال ہو گیا ہے۔ اسکی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی امراضِ جگر کا ماہر انسانی جسم کے مجموعی نظام سے الگ کر کے، اور اس نظام میں جگر کی حیثیت جو ہے اسکو نظر انداز کر کے جگر کو بس جگر ہونے کی حیثیت سے دیکھنا شروع کر دے، اور پھر اس دیکھنے میں اتنا مستغرق ہو کہ آخر کار اسے پورا انسانی جسم بس ایک جگر ہی جگر نظر آنے لگے۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اگر انسانی صحت کے سارے مسائل کو صرف جگریات سے حل کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ مسائل کس قدر ناقابلِ حل ہو جائینگے اور آدمی بے چارے کی جان کس قدر شدید خطرے میں مبتلا ہو کر رہیگی۔ بس اسی پر قیاس کر لیجیے کہ جب معاشیات کو انسانیت کے مجموعہ میں سے نکال کر الگ کر لیا جائے، اور پھر اسکو عین انسانیات قرار دیکر سارے مسائل زندگی اسی سے حل کیے جانے لگیں تو بجز سرگشتگی و حیرانی کے اور کیا حاصل ہو سکتا ہے۔

دورِ جدید کے فتنوں میں سے یہ ماہرین خصوصی (Specialists) کا فتنہ بھی ایک بڑا فتنہ ہے۔ زندگی اور اسکے مسائل پر مجموعی نظر کم سے کم تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ انسان مختلف علوم

کے یک چشم ماہرین کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ گیا ہے۔ کوئی طبیعیات کا ماہر ہے تو وہ ساری کائنات کا معاملہ طبیعیات کے بل پر حل کرنے لگتا ہے۔ کسی کے دماغ پر نفسیات کا تسلط ہے تو وہ اپنے نفسیاتی تجربات و مشاہدات کے اعتماد پر پورا فلسفۂ حیات مرتب کرنا چاہتا ہے۔ کسی اللہ کے بندے کی نظر صنفیات پر جم کر رہ گئی ہے تو وہ کہتا ہے کہ پوری انسانی زندگی بس شہوانیت (Sex) کے محور پر گھوم رہی ہے حتیٰ کہ خدا کا خیال بھی انسان کے دماغ میں اسی رستے سے آیا ہے۔ اِسی طرح جو لوگ معاشیات میں مستغرق ہیں وہ انسان کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ معاش تیری زندگی کا اصل مسئلہ ہے اور باقی سارے مسائل اِسی جڑ کی شاخیں ہیں۔ حالانکہ اصل حقیقت جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب ایک کُل کے مختلف پہلو ہیں۔ اُس کُل کے اندر اِن سب کا ایک خاص مقام ہے اور اُس مقام کے لحاظ ہی سے انکی اہمیت بھی ہے۔ انسان ایک جسم رکھتا ہے جو قوانین طبیعی کے ماتحت ہے۔ اِس لحاظ سے انسان طبیعیات کا موضوع بھی ہے۔ مگر وہ نرا جسم ہی نہیں ہے کہ صرف طبیعیات سے اُسکے سارے مسائل حل کیے جا سکیں۔ انسان ایک ذی حیات ہستی ہے جس پر حیاتی قوانین جاری ہوتے ہیں۔ اِس لحاظ سے وہ علم الحیات (Biology) کا موضوع ہے مگر وہ نرا ذی حیات نہیں ہے کہ صرف حیاتیات یا حیوانیات (Zoology) ہی سے اسکی زندگی کا پورا قانون اخذ کیا جا سکے۔ انسان کو زندہ رہنے کے لیے غذا کی، پوشش کی، اور مکان کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اِس لحاظ سے معاشیات اسکی زندگی کے ایک اہم شعبہ پر حاوی ہے۔ مگر وہ محض ایک کھانے، پہننے اور گھر بنا کر رکھنے والا حیوان ہی نہیں ہے کہ تنہا معاشیات ہی پر اسکے پورے فلسفۂ حیات کی بنا رکھ دی جائے۔ انسان اپنی نوع کو باقی رکھنے کے لیے تناسل پر بھی مجبور ہے جسکے لیے اُسکے اندر ایک زبردست صنفی میلان پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے صنفیات کا علم بھی اُسکی زندگی کے ایک اہم پہلو سے تعلق رکھتا ہے مگر وہ بالکل نسل کشی کا آلہ ہی نہیں ہے کہ بس صنفیات ہی کی عینک لگا کر اسے دیکھا جانے لگے۔ انسان ایک نفس رکھتا ہے جس میں شعور و ادراک کی مختلف قوتیں اور جذبات و خواہشات کی مختلف طاقتیں پائی

اس لحاظ سے نفسیات اسکے وجود کے ایک بڑے شعبہ پر محیط ہے۔ لیکن وہ از سرتاپا نفس ہی نفس نہیں ہے، کہ نفسیات کے علم سے اسکی زندگی کی پوری اسکیم بنائی جا سکے۔ انسان ایک متمدن ہستی ہے جو عین اپنی فطرت کے لحاظ سے مجبور ہے کہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر رہے۔ اس لحاظ سے اسکی زندگی کے بہت سے پہلو عمرانیات کے تحت آتے ہیں۔ لیکن متمدن ہستی ہونا اُسکا تمام وجود نہیں ہے کہ محض علوم عمران کے ماہرین بیٹھ کر اسکے لیے مکمل نظام حیات وضع کر سکیں۔ انسان ایک ذی عقل ہستی ہے جس کے اندر محسوسات سے ماورا معقولات کی طلب پائی جاتی ہے اور وہ عقلی اطمینان چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے علوم عقلیہ اسکے ایک خاص مطالبہ کو پورا کرتے ہیں۔ مگر وہ پورا عقل ہی نہیں ہے کہ محض معقولات کے بل بوتے پر اسکے لیے ایک لائحۂ زندگی بنایا جا سکے۔ انسان ایک اخلاقی و روحانی وجود ہے جس میں بھلے اور برے کا امتیاز، اور محسوسات و معقولات دونوں سے ماورا حقیقتوں تک پہنچنے کا داعیہ بھی پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اخلاقیات و روحانیات اُسکے ایک اور اہم مطالبہ کو پورا کرتے ہیں۔ مگر وہ از سرتاپا اخلاق اور روح ہی نہیں ہے کہ مجرّد اخلاقیات و روحانیات سے اسکے لیے پورا نظام زندگی بنایا جا سکے۔ دراصل انسان بیک وقت یہ سب کچھ ہے، اور ان تمام حیثیتوں کے علاوہ اسکی ایک حیثیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے تمام وجود اور اپنی زندگی کے سارے شعبوں سمیت کائنات کے اس عظیم الشان نظام کا ایک جزو ہے، اور اسکی زندگی کا ضابطہ لازمی طور پر اس امر کا تعین چاہتا ہے کہ اس کائنات میں اسکی حیثیت کیا ہے اور اس کا جزو ہونے کی حیثیت سے اس کو کس طرح کام کرنا چاہیے۔ نیز اسکے لیے یہ بھی ناگزیر ہے کہ وہ اپنے مقصد زندگی کا تعین کرے اور اسی کے لحاظ سے فیصلہ کرے کہ اسے کس لیے کام کرنا ہے۔ یہ آخری دونوں سوال انسانی زندگی کے بنیادی سوال ہیں۔ انہی پر ایک فلسفۂ حیات بنتا ہے، پھر اس فلسفۂ حیات کے تحت تمام وہ علوم جو دنیا اور انسان سے تعلق رکھتے ہیں، اپنے اپنے دائرے کی معلومات فراہم کرتے ہیں اور کم و بیش ان سب

سے مل کر ایک لائحۂ عمل بنتا ہے جس پر انسانی زندگی کا پورا کارخانہ چلتا ہے۔

اب یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر آپ اپنی زندگی کے کسی مسئلہ کو سمجھنا چاہیں تو اس کے لیے یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے کہ آپ خوردبین لگا کر صرف اسی ایک مسئلہ پر اپنی نظر کو محدود کر کے دیکھیں یا اُس خاص شعبۂ حیات کے لیے جس سے وہ مسئلہ تعلق رکھتا ہے، ایک قسم کا نصب لیے ہوئے پورے مجموعۂ حیات پر نگاہ ڈالیں، بلکہ صحیح فہم و ادراک کے لیے آپکو پورے مجموعہ کے اندر رکھ کر اسے دیکھنا ہوگا اور غیر متعصبانہ نگاہ سے دیکھنا ہوگا۔ اسی طرح اگر آپ زندگی کے توازن میں کوئی بگاڑ پائیں اور اسکو درست کرنا چاہیں تو یہ اور بھی زیادہ خطرناک ہے کہ آپ کسی ایک مسئلہ زندگی کو کل مسئلہ زندگی قرار دے کر سارے کارخانے کو اسی ایک پُرزے کے گرد گھما دیں۔ اس حرکت سے تو آپ اور زیادہ عدم توازن پیدا کر دینگے۔ صحیح طریق اصلاح یہ ہے کہ غیر متعصبانہ نظر سے پورے نظام زندگی کو اسکے بنیادی فلسفے سے لیکر شاخوں کی تفصیلات تک دیکھیے اور تحقیق کیجیے کہ خرابی کس جگہ اور کس نوعیت کی ہے۔

انسان کے معاشی مسئلے کو سمجھنے اور صحیح طور پر حل کرنے میں جو مشکل پیش آ رہی ہے اسکی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس مسئلے کو بعض لوگ صرف معاشیات کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بعض اسکی اہمیت میں مبالغہ کر کے اُسے کُل مسئلۂ زندگی قرار دے رہے ہیں۔ اور بعض اس سے بھی تجاوز کر کے زندگی کا بنیادی فلسفہ اور اخلاق و تمدن و معاشرت کا سارا نظام معاشی بنیاد ہی پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اگر معاشیات ہی کو اساس ٹھیرایا جائے تو انسان کا مقصد زندگی اُس بیل کے مقصد زندگی سے کچھ بھی مختلف نہیں ٹھیرتا جسکی تمام سعی و جہد کی غایت یہ ہے کہ ہری ہری گھاس کھا کر خوش و خرم اور تنومند ہو جائے اور کائنات میں اُسکی حیثیت یہ قرار پاتی ہے کہ وہ بس چراگاہِ عالم میں ایک آزاد چرندہ ہے۔ اسی طرح اخلاقیات، روحانیات، معقولات، عمرانیات، نفسیات اور تمام دوسرے علوم کے دائروں میں

بھی معاشی نقطۂ نظر کے غالب آجانے سے نہایت شدید عدمِ توازن کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، کیونکہ ان شعبہائے زندگی کے لیے معاشیات میں کوئی بنیاد اس کے سوا نہیں ہے کہ اخلاق و روحانیت نفس پرستی و مادہ پرستی میں، اور معقولات ماکولات میں تبدیل ہو جائیں، عمرانیات کی ساری ترتیب حقائق عمرانی کے بجائے کاروباری اغراض پر قائم ہو، اور نفسیات میں انسان کا مطالعہ محض ایک معاشی حیوان کی حیثیت سے کیا جانے لگے۔ کیا اس سے بڑھ کر انسانیت پر کوئی اور ظلم ہو سکتا ہے؟

اصل معاشی مسئلہ اب اگر ہم اصطلاحی اور فنی پیچیدگیوں سے بچ کر ایک سیدھے سادے طریقے سے دیکھیں تو انسان کا معاشی مسئلہ ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ تمدن کی رفتارِ ترقی کو قائم رکھتے ہوئے کس طرح تمام انسانوں کو ان کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچنے کا انتظام ہو، اور کس طرح سوسائٹی میں ہر شخص کو اپنی استعداد و قابلیت کے مطابق ترقی کرنے اور اپنی شخصیت کو نشوونما دینے اور اپنے کمال لائق تک پہنچنے کے مواقع حاصل رہیں۔

قدیم ترین زمانہ میں انسان کے لیے معاش کا مسئلہ قریب قریب اُتنا ہی سہل تھا جتنا حیوانات کے لیے ہے۔ خدا کی زمین پر بے شمار سامانِ زندگی پھیلا ہوا ہے۔ ہر مخلوق کے لیے جس قسم کے رزق کی ضرورت ہے وہ بافراط مہیا ہے۔ ہر ایک اپنا رزق تلاش کرنے کے لیے نکلتا ہے اور جا کر خزائنِ رزق میں سے حاصل کر لیتا ہے۔ کسی کو نہ اسکی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور نہ اس کا رزق کسی دوسری مخلوق کے قبضہ میں ہے۔ تقریباً یہی حالت انسان کی بھی تھی کہ گیا اور قدرتی رزق خواہ وہ پھلوں کی شکل میں ہو یا شکار کے جانوروں کی شکل میں، حاصل کر لایا۔ قدرتی پیداوار سے بدن ڈھانکنے کا انتظام کر لیا۔ زمین میں جہاں موقع دیکھا ایک سر چھپانے اور پڑ رہنے کی جگہ بنالی لیکن خدا نے انسان کو اسلیے پیدا نہیں کیا تھا کہ وہ زیادہ مدت تک اسی حال میں رہے۔ اس نے انسان کے اندر ایسے فطری داعیات رکھے تھے کہ وہ انفرادیت چھوڑ کر اجتماعی زندگی اختیار کرے، اور

اپنی صنعت سے اپنے لیے ان ذرائع زندگی سے بہتر ذرائع پیدا کرے جو قدرت نے مہیا کیے تھے - عورت اور مرد کے درمیان دائمی تعلق کی فطری خواہش، انسانی بچے کا طویل مدت تک ماں باپ کی پرورش کا محتاج ہونا، اپنی نسل کے ساتھ انسان کی گہری دلچسپی، اور خونی رشتوں کی محبت، یہ وہ چیزیں تھیں جو اجتماعی زندگی پر مجبور کرنے کے لیے خود فطرت ہی نے اسکے اندر رکھ دی تھیں - اسی طرح انسان کا خود رو پیداوار پر قانع نہ ہونا اور زراعت سے اپنے لیے خود غلہ پیدا کرنا، پتوں سے جسم ڈھانکنے پر قانع نہ ہونا اور اپنی صنعت سے اپنے لیے لباس بنانا، غاروں اور بھٹوں میں رہنے پر مطمئن نہ ہونا اور اپنے لیے خود مکان تیار کرنا، اپنی ضروریات کے لیے جسمانی آلات پر اکتفا نہ کرنا اور پتھر، لوہے، لکڑی وغیرہ کے آلات ایجاد کرنا، یہ بھی فطرت ہی نے اسکے اندر ودیعت کیا تھا، اور اس کا بھی لازمی نتیجہ یہی تھا کہ وہ رفتہ رفتہ متمدن ہو - پس اگر انسان متمدن ہوا تو اُس نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ عین اسکی فطرت کا تقاضا اور اسکے خالق کا منشا یہی تھا -

تمدن کی پیدائش کے ساتھ چند چیزیں ناگزیر تھیں :-

ایک یہ کہ انسان کی ضروریات زندگی بڑھیں اور ہر شخص خود اپنی تمام ضروریات فراہم نہ کر سکے بلکہ اسکی کچھ ضرورتیں دوسروں سے اور دوسروں کی اُس سے متعلق ہوں -

دوسرے یہ کہ ضروریات زندگی کا مبادلہ (Exchange) عمل میں آئے اور رفتہ رفتہ مبادلۂ اشیاء کا ایک واسطہ (Medium of Exchange) مقرر ہو جائے -

تیسرے یہ کہ اشیائے ضرورت تیار کرنے کے آلات اور حمل و نقل کے وسائل میں اضافہ ہو اور جتنی نئی چیزیں انسان کے علم میں آئیں اُن سب سے وہ فائدہ اٹھاتا چلا جائے -

چوتھے یہ کہ آدمی کو اس امر کا اطمینان حاصل ہو کہ وہ چیزیں جنکو اس نے خود اپنی محنت سے حاصل کیا ہے، وہ آلات جن سے وہ کام کرتا ہے، وہ زمین جس پر اس نے گھر بنایا ہے، وہ جگہ جس

میں وہ اپنے پیشہ کا کام کرتا ہے، یہ سب اُسی کے قبضہ میں رہینگی اور اُسکے بعد اُن لوگوں کی طرف منتقل ہونگی جو دوسروں کی بہ نسبت اُس سے قریب تر ہیں۔

اس طرح مختلف پیشوں کا پیدا ہونا، خرید و فروخت اور اشیاء کی قیمتوں کا تعین، روپے کا معیارِ قیمت کی حیثیت سے جاری ہونا، بین الاقوامی لین دین اور درآمد و برآمد تک نوبت پہنچنا، نئے نئے آلات و وسائلِ پیدائش (Means of production) کا استعمال میں آنا، اور حقوقِ ملکیت اور وراثت کا وجود میں آنا، یہ سب کچھ عین مقتضائے فطرت تھا اور ان میں سے بھی کوئی چیز گناہ نہ تھی کہ اب اس سے توبہ کرنے کی ضرورت ہو۔

مزید برآں تمدن کے نشوونما کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ:

(۱) مختلف انسانوں کی قوتوں اور قابلیتوں کے درمیان جو فرق خود فطرت نے رکھا ہے اسکی وجہ سے بعض انسانوں کو اپنی اصلی ضرورت سے زیادہ کمانے کا موقع مل جائے اور بعض اپنی ضرورت کے مطابق، اور بعض اس سے کم کمائیں۔

(۲) وراثت کے ذریعہ سے بھی بعض کو زندگی کا آغاز کرنے کے لیے اچھے وسائل مل جائیں اور بعض کم وسائل کے ساتھ اور بعض بے وسیلہ کارزارِ حیات میں قدم رکھیں۔

(۳) قدرتی اسباب سے بھی ہر آبادی میں ایسے لوگ موجود رہیں جو کسبِ معاش کے کام میں حصہ لینے اور اسبابِ زندگی کے مبادلہ میں شریک ہونے کے قابل نہ ہوں، مثلاً بچے، بوڑھے، بیمار، معذور وغیرہ۔

(۴) بعض انسان خدمت لینے والے اور بعض خدمت انجام دینے والے ہوں اور اس طرح آزادانہ صنعت و تجارت اور زراعت کے علاوہ نوکری اور مزدوری کی صورتیں بھی پیدا ہو جائیں۔

یہ سب بھی بجائے خود انسانی تمدن کے فطری مظاہر اور قدرتی پہلو ہیں۔ ان صورتوں کا رونما ہونا بھی اپنی جگہ کوئی برائی یا گناہ نہیں ہے کہ اِن کے استیصال کی فکر کی جائے۔ تمدن کی خرابی کے دوسرے اسباب سے جو برائیاں پیدا ہوئی ہیں اُنکے اصل سبب کو نہ پا کر بہت سے لوگ گھبرا اٹھتے ہیں اور کبھی شخصی ملکیت کو، کبھی روپے کو، کبھی مشین کو، کبھی انسانوں کی فطری نامساوات کو، اور کبھی خود تمدن ہی کو کوسنے لگتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ غلط تشخیص اور غلط تجویزِ علاج ہے۔ انسانی فطرت کے تقاضے سے تمدن میں جو نشوونما ہوتا ہے، اور اس نشوونما سے فطرۃً جو صورتیں رونما ہوتی ہیں انکو روکنے کی ہر کوشش نادانی ہے اور اسکے نتیجہ میں فلاح کے بجائے تباہی و نقصان کا زیادہ امکان ہے۔ انسان کا اصل معاشی مسئلہ یہ نہیں ہے کہ تمدن کی ترقی کو کس طرح روکا جائے، یا اسکے قدرتی مظاہر کو کس طرح بدلا جائے، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ تمدن کے نشوونما کی فطری رفتار کو برقرار رکھتے ہوئے اجتماعی ظلم و بے انصافی کو کیسے روکا جائے، اور فطرت کا یہ منشا کہ ہر مخلوق کو اسکا رزق پہنچے، کیونکر پورا کیا جائے، اور اُن رکاوٹوں کو کس طرح دور کیا جائے جنکی بدولت بہت سے انسانوں کی قوتیں اور قابلیتیں محض وسائل کے فقدان کی وجہ سے ضائع ہو جاتی ہیں۔

معاشی انتظام کی خرابی کا سبب

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ خرابی کے اصل اسباب کیا ہیں اور خرابی کی نوعیت کیا ہے۔

نظامِ معیشت کی خرابی کا نقطۂ آغاز خود غرضی کا حدِ اعتدال سے بڑھ جانا ہے۔ پھر دوسرے رذائلِ اخلاق اور ایک فاسد نظامِ سیاست کی مدد سے یہ چیز بڑھتی اور پھیلتی ہے یہاں تک کہ پورے معاشی انتظام کو خراب کر کے زندگی کے باقی شعبوں میں بھی اپنا زہریلا اثر پھیلا دیتی ہے۔ ابھی میں بیان کر چکا ہوں کہ شخصی ملکیت، اور بعض انسانوں کا بعض کی بہ نسبت بہتر معاشی حالت میں ہونا، یہ دونوں عین فطرت کے مقتضیات سے تھے اور بجائے خود ان میں کوئی خرابی نہ تھی۔ اگر انسان

کی تمام اخلاقی صفات کو توازن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا اور خارج میں بھی ایک ایسا نظامِ سیاست موجود ہوتا جو زور و قوت کے ساتھ عدل قائم رکھتا تو اِن سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو سکتی تھی - لیکن جس چیز نے انہیں خرابیوں کی پیدائش کا ذریعہ بنا دیا وہ یہ تھی کہ جو لوگ فطری اسباب سے بہتر معاشی حیثیت رکھتے تھے وہ خود غرضی، تنگ نظری، بداندیشی، حرص، بخل، بد دیانتی، اور نفس پرستی میں مبتلا ہو گئے - شیطان نے انہیں یہ سمجھایا کہ تمہاری اصلی ضرورت سے زائد جو وسائل معیشت تمہیں ملتے ہیں اور جن پر تمہیں حقوق مالکانہ حاصل ہیں، اُنکے صحیح و معقول مصرف صرف دو ہیں: ایک یہ کہ ان کو اپنی آسائش، آرائش، لطف، تفریح اور خوش باشی میں صرف کرو۔ دوسرے یہ کہ ان کو مزید وسائل معیشت پر قبضہ کرنے کے لیے استعمال کرو، اور بن پڑے تو انہی کے ذریعہ سے انسانوں کے خدا اور اَن داتا بھی بن جاؤ -

پہلی شیطانی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت مندوں نے جماعت کے اُن افراد کا حق ماننے سے انکار کر دیا جو دولت کی تقسیم میں حصہ پانے سے محروم رہ جاتے ہیں یا اپنی اصلی ضرورت سے کم حصہ پاتے ہیں - انہوں نے یہ بالکل جائز سمجھا کہ اِن لوگوں کو فاقہ کشی اور خستہ حالی میں چھوڑ دیا جائے - انکی تنگ نظری نے یہ نہ دیکھا کہ اس رویّہ کی وجہ سے انسانی جماعت کے بہت سے افراد جرائم پیشہ بنتے ہیں، جہالت اور دناءت اخلاق میں مبتلا ہوتے ہیں، جسمانی کمزوری اور امراض کا شکار رہتے ہیں، انکی ذہنی و جسمانی قوتیں نشوونما پانے اور انسانی تمدن و تہذیب کے ارتقاء میں اپنا حصہ ادا کرنے سے رہ جاتی ہیں، اور اس سے وہ سوسائیٹی بحیثیت مجموعی نقصان اٹھاتی ہے جسکے وہ خود بھی ایک جُزء ہیں - اسی پر بس نہیں بلکہ ان دولت مندوں نے اپنی اصلی ضروریات پر بے شمار اور ضروریات کا اضافہ کیا اور بہت سے انسانوں کو جنکی قابلیتیں تمدن و تہذیب کی بہتر خدمات کے لیے استعمال ہو سکتی تھیں اپنے نفسِ شریر کی خود ساختہ ضرورتوں کے پورا کرنے میں استعمال کرنا شروع کر دیا - اُن کے لیے زنا ایک ضرورت تھی جسکی خاطر فاحشہ

عورتوں اور قرمساقوں اور دیوثوں کا ایک لشکر فراہم ہوا - اُن کے لیے غنا بھی ایک ضرورت تھی جسکی خاطر گویّوں، بجنیوں، سازندوں، اور آلات موسیقی تیار کرنے والوں کی ایک اور فوج تیار کی گئی اُنکے لیے بے شمار قسم کی تفریحات بھی ضروری تھیں جنکی خاطر مسخروں، نقالوں، ایکٹروں اور ایکٹرسوں داستان گویوں، مصوروں اور نقاشوں اور بہت سے فضول پیشہ وروں کا ایک اور گروہ کثیر مہیا کیا گیا - اُنکے لیے شکار بھی ضروری تھا جسکی خاطر بہت سے انسان کوئی بھلا کام کرنے کے بجائے اِس کام پر لگائے گئے کہ جنگلوں میں جانوروں کو ہانکتے پھریں - اُنکے لیے سرور و نشاط اور خود رفتگی بھی ایک ضرورت تھی جسکی خاطر بہت سے انسان شراب، کوکین، افیون، اور دوسرے مُسکرات کی فراہمی میں مشغول کیے گئے - غرض اس طرح اِن شیطان کے بھائیوں نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا کہ بے رحمی کے ساتھ سوسائیٹی کے ایک بڑے حصہ کو اخلاقی و روحانی اور جسمانی تباہی میں مبتلا ہونے کے لیے چھوڑ دیا ہو، بلکہ مزید ظلم یہ کیا کہ ایک اور بڑے حصہ کو صحیح اور مفید کاموں سے ہٹا کر بیہودہ، ذلیل اور نقصان دہ کاموں میں لگا دیا، اور تمدن کی رفتار کو راہِ راست سے ہٹا کر ایسے راستوں کی طرف پھیر دیا جو انسان کو تباہی کی طرف لے جانے والے ہیں - پھر معاملہ اسی پر ختم نہیں ہو گیا - انسانی سرمایہ (Human capital) کو ضائع کرنے کے ساتھ انہوں نے مادّی سرمایہ کو بھی غلط طریقہ سے استعمال کیا - اِنکو محلات، کوٹھیوں، گلستانوں، تفریح گاہوں، ناچ گھروں وغیرہ کی ضرورت لاحق ہوئی، حتیٰ کہ مرنے کے بعد زمین میں لیٹنے کے لیے بھی اِن کمبختوں کو ایکڑوں زمین اور عالیشان عمارتوں کی حاجت در پیش ہوئی، اور اس طرح وہ زمین، وہ سامانِ تعمیر اور وہ انسانی محنت جو بہت سے بندگانِ خدا کے لیے سکونت کا انتظام کرنے کو کافی ہو سکتی تھی، ایک ایک عیاش آدمی کے مُستقر اور مُستودع پر صرف ہو گئی - ان کو زیوروں، نفیس لباسوں، اعلیٰ درجہ کے آلات و ظروف، زینت و آرائش کے سامانوں، شاندار سواریوں اور نہ معلوم کن کن چیزوں کی ضرورت پیش آئی - حتیٰ کہ اِن ظالموں کے دروازے

بھی قیمتی پردوں کے بغیر ننگے رہے جاتے تھے، انکی دیواریں بھی سینکڑوں اور ہزاروں روپے کی تصویروں سے مزین ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھیں، انکے کمروں کی زمین بھی ہزاروں روپے کے قالین اوڑھنا چاہتی تھی، انکے کتوں کو بھی مخمل کے گدے اور سونے کے پٹے درکار تھے۔ اس طرح وہ بہت سا مواد اور وہ کثیر انسانی عمل جو ہزارہا انسانوں کا تن ڈھانکنے اور پیٹ بھرنے کے کام آسکتا تھا ایک ایک شخص کی نفس پرستی کے لیے وقف ہوگیا۔

یہ تو شیطانی رہنمائی کے ایک حصہ کا نتیجہ تھا۔ دوسری رہنمائی کے نتائج اس سے بھی زیادہ خراب نکلے۔ یہ اصول کہ اپنی اصلی ضرورت سے زائد جو وسائل معیشت کسی انسان کے قبضہ میں آگئے ہوں انکو وہ جمع کرتا چلا جائے، اور پھر مزید وسائل معیشت حاصل کرنے کے لیے استعمال کرے، اول تو بداہۃً غلط ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا نے معیشت کے اسباب جو زمین پر پیدا کیے ہیں یہ مخلوق کی حقیقی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے پیدا کیے ہیں۔ تمہارے پاس اگر خوش قسمتی سے کچھ زیادہ اسباب آگئے ہیں تو یہ دوسروں کا حصہ تھا جو تم تک پہنچ گیا۔ اسے جمع کرنے کہاں چلے ہو؟ اپنے گرد و پیش دیکھو، جو لوگ سامانِ زیست میں اپنا حصہ حاصل کرنے کے قابل نظر نہیں آتے، یا اسے حاصل کرنے میں ناکام رہ گئے ہیں، یا جنہوں نے اپنی ضرورت سے کم پایا ہے، سمجھ لو کہ یہی لوگ ہیں جنکا حصہ تمہارے پاس پہنچا ہے۔ وہ حاصل نہیں کرسکے تو تم ان تک پہنچا دو۔ یہ صحیح کام کرنے کے بجائے اگر تم ان اسباب کو اور زیادہ اسبابِ معاش حاصل کرنے کے لیے استعمال کروگے تو یہ غلط کام ہوگا، کیونکہ بہرحال وہ مزید اسباب جو تم حاصل کروگے تمہاری ضرورت سے اور بھی زیادہ ہونگے۔ پھر ان کے حصول کی کوشش بجز اسکے کہ تمہاری حرص و ہوس کی تسکین کا ذریعہ ہو اور کیا مفید پہلو رکھتی ہے؟ حصولِ معاش کی سعی میں تم اپنے وقت، محنت اور قابلیت کا جتنا حصہ اپنی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کے لیے صرف کرتے ہو وہ تو صحیح اور معقول مصرف میں صرف ہوتا ہے۔ مگر اس واقعی ضرورت سے زائد ان چیزوں کو اس کام میں صرف کرنے کے معنی یہ ہیں کہ تم معاشی

حیوان بلکہ دولت پیدا کرنے کی مشین بن رہے ہو۔ حالانکہ تمہارے وقت، محنت اور ذہنی و جسمانی قوتوں کے لیے کسبِ معاش کے سوا اور زیادہ بہتر مصرف بھی ہیں۔ پس عقل اور فطرت کے لحاظ سے یہ اصول ہی سرے سے غلط ہے جو شیطان نے اپنے شاگردوں کو سکھایا ہے۔ لیکن اس اصول پر جو عملی طریقے بنے ہیں وہ تو اس قدر قابلِ لعنت اور اُنکے نتائج اتنے ہولناک ہیں کہ ان کا صحیح تخمینہ بھی مشکل ہے۔

زائد از ضرورت وسائلِ معیشت کو مزید وسائل قبضہ میں لانے کے لیے استعمال کرنے کی دو صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ ان وسائل کو سود پر قرض دیا جائے۔

دوسرے یہ کہ انہیں تجارتی اور صنعتی کاموں میں لگایا جائے۔

یہ دونوں طریقے اپنی نوعیت میں کچھ ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہیں، لیکن دونوں کے مشترک عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی دو طبقوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک وہ قلیل طبقہ جو اپنی ضروریات سے زیادہ وسائلِ معاش رکھتا ہے اور اپنے وسائل کو مزید وسائل کھینچنے کیلئے وقف کر دیتا ہے۔ دوسرا وہ کثیر طبقہ جو اپنی ضرورت کے مطابق، یا اس سے کم وسائل رکھتا ہے یا بالکل نہیں رکھتا۔ ان دونوں طبقوں کے مفاد نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کے خلاف ہوتے ہیں بلکہ لامحالہ انکے درمیان کشمکش اور نزاع برپا ہوتی ہے، اور یوں انسان کا معاشی انتظام جسکو فطرت نے مبادلہ پر قائم کیا تھا، محاربہ پر قائم ہو کر رہ جاتا ہے۔

پھر یہ محاربہ جتنا جتنا بڑھتا جاتا ہے، مالدار طبقہ تعداد میں کم اور نادار طبقہ زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے، کیونکہ اس محاربہ کی نوعیت ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ جو زیادہ مالدار ہے وہ اپنے مال کے زور سے کم مالدار لوگوں کے وسائل بھی کھینچ لیتا ہے اور اسے نادار طبقہ میں دھکیل دیتا ہے۔

اس طرح زمین کے اسباب معاش روز بروز کم اور کم تر حصہ آبادی کے پاس سمٹتے چلے جاتے ہیں اور روز بروز زیادہ اور زیادہ حصہ آبادی مفلس یا مالداروں کا دست نگر ہوتا جاتا ہے۔

ابتداءً یہ عارضہ چھوٹے پیمانے پر شروع ہوتا ہے، پھر بڑھتے بڑھتے یہ ملکوں اور قوموں تک پھیلتا ہے یہاں تک کہ ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے کر بھی ھل من مزید ہی کی صدا لگاتا ہے۔ اسکی صورت یہ ہے کہ جب ایک ملک کا عام دستور یہ ہو جاتا ہے کہ جن لوگوں کے پاس اپنی ضرورت سے زائد مال ہو وہ اپنے فاضل مال کو نفع آور کاموں میں لگا دیں اور یہ دولت اشیاء ضرورت کی تیاری پر صرف ہو، تو انکی لگائی ہوئی پوری رقم کا فائدے سمیت وصول ہونا اس بات پر موقوف ہوتا ہے کہ جس قدر اشیاء ملک میں تیار ہوئی ہیں وہ سب کی سب اُسی ملک میں خرید لی جائیں، مگر عملاً ایسا نہیں ہوتا اور درحقیقت ہو نہیں سکتا، کیونکہ ضرورت سے کم مال رکھنے والوں کی قوت خریداری کم ہوتی ہے اسلیے وہ ضرورت مند ہونے کے باوجود ان چیزوں کو خرید نہیں سکتے، اور ضرورت سے زیادہ مال رکھنے والے اس فکر میں ہوتے ہیں کہ جتنی آمدنی ہو اُس میں سے پھر ایک حصہ پس انداز کر کے نفع آور کاموں میں لگائیں اسلیے وہ اپنا سب مال خریداری پر صرف نہیں کرتے۔ اس طرح لازمی طور پر تیار کردہ مال کا ایک حصہ فروخت ہوئے بغیر رہ جاتا ہے، جسکے دوسرے معنی یہ ہیں کہ مالداروں کی لگائی ہوئی رقم کا ایک حصہ بازیافت ہونے سے رہ گیا اور یہ رقم ملک کی حرفت (Industry) کے ذمہ قرض رہا۔ یہ صرف ایک چکر کا حال ہے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسے جتنے چکر ہونگے ان میں سے ہر ایک میں مال دار طبقہ اپنی حاصل شدہ آمدنی کا ایک حصہ پھر نفع آور کاموں پر لگاتا چلا جائیگا، اور جو رقمیں بازیافت ہونے سے رہ جاتی ہیں اُنکی مقدار ہر چکر میں بڑھتی چلی جائیگی اور ملک کی حرفت پر ایسے قرض کا بار دوگنا، چوگنا، ہزار گنا ہوتا چلا جائیگا جسکو خود وہ ملک کبھی ادا نہیں کر سکتا۔ اس طرح ایک ملک کو دیوالیہ پن کا جو خطرہ لاحق ہوتا ہے اُس سے بچنے کی کوئی صورت اسکے سوا نہیں کہ جتنا مال ملک میں

فروخت ہونے سے رہ جائے اسے دوسرے ملکوں میں لیجاکر فروخت کیا جائے یعنی ایسے ملک تلاش کیے جائیں جنکی طرف یہ ملک اپنے دیوالیہ پن کی آفت کو منتقل کردے۔

یوں یہ محاربہ ملکی حدود سے گذر کر بین الاقوامی دائرے میں قدم رکھتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ کوئی ایک ملک ہی ایسا نہیں ہے جو اس شیطانی نظام معیشت پر چل رہا ہو، بلکہ دنیا کے اکثر ممالک کا یہی حال ہے کہ وہ اپنے آپ کو دیوالیہ پن سے بچانے کے لیے، یا بالفاظ دیگر اپنے دیوالہ کو کسی اور ملک پر ڈال دینے کے لیے مجبور ہو گئے ہیں۔ اس طرح بین الاقوامی مسابقت شروع ہو جاتی ہے اور وہ چند صورتیں اختیار کرتی ہے۔

اولاً ہر ملک بین الاقوامی بازار میں اپنا مال زیادہ بیچنے کے لیے کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم لاگت پر زیادہ مال تیار کرے۔ اس غرض سے کارکنوں کے معاوضے بہت کم رکھے جاتے ہیں اور معاشی کاروبار میں ملک کی عام آبادی اتنا کم حصہ پاتی ہے کہ اس کی اصلی ضروریات بھی پوری نہیں ہوتیں۔

ثانیاً ہر ملک اپنے حدود میں، اور اپنے حلقۂ اثر میں دوسرے ملک کا مال آنے پر بندشیں عائد کرتا ہے، اور خام پیداوار کے جتنے وسائل اسکے زیر اختیار رہیں ان پر بھی پہرے بٹھاتا ہے تاکہ دوسرا ملک ان سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس سے بین الاقوامی کشمکش پیدا ہوتی ہے جس کا انجام جنگ پر ہوتا ہے۔

ثالثاً ایسے ملک جو اس دیوالیہ پن کی مصیبت کو اپنے سر چپکے جانے سے روک نہیں سکتے اُن پر لٹیرے ٹوٹ پڑتے ہیں اور صرف اپنے ملک کے بچے کھچے مال ہی کو ان میں فروخت کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ جس دولت کو خود اپنے ہاں نفع آور کام پر لگانے کی گنجائش نہیں ہوتی اسے بھی اُن ممالک میں لے جاکر لگاتے ہیں۔ اس طرح آخرکار اُن ممالک میں بھی وہی مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے جو ابتداءً خود روپیہ لگانے والے ملکوں میں پیدا ہوا تھا۔ یعنی جس قدر روپیہ وہاں لگایا جاتا ہے وہ سارا

کا سارا وصول نہیں ہو سکتا، اور اس روپے سے جتنی بھی آمدنی ہوتی ہے اسکا ایک بڑا حصہ پھر مزید نفع آور کاموں میں لگا دیا جاتا ہے، حتیٰ کہ ان ملکوں پر قرض کا بار اتنا بڑھتا چلا جاتا ہے کہ اگر خود ان ملکوں کو بیچ ڈالا جائے، تب بھی کُل لگائی ہوئی رقم بازیافت نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ چکر اگر یونہی چلتا رہے تو بالآخر تمام دنیا دیوالیہ ہو جائیگی اور روئے زمین پر کوئی خطہ ایسا باقی نہ رہیگا جسکی طرف اس دیوالیہ پن کی مصیبت کو منتقل کیا جاسکے، حتیٰ کہ پھر ضرورت پیش آئیگی کہ مریخ اور مشتری اور عطارد میں روپیہ لگانے اور زائد مال کو کھپانے کے لیے، مارکٹ تلاش کیے جائیں۔

اس عالمگیر محاربہ میں بینکروں، آڑھتیوں، اور صنعت و تجارت کے رئیسوں کی ایک مٹھی بھر جماعت تمام دنیا کے معاشی اسباب و وسائل پر اس طرح حاوی ہو گئی ہے کہ ساری نوع انسانی ان کے مقابلے میں بالکل بے بس ہے۔ اب کسی شخص کے لیے یہ قریب قریب ناممکن ہو گیا ہے کہ اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت سے اور اپنے دماغ کی قابلیت سے کوئی آزادانہ کام کرسکے اور خدا کی زمین پر جو اسباب زندگی موجود ہیں ان میں سے خود کوئی حصہ حاصل کرسکے۔ چھوٹے تاجر، چھوٹے صناع، چھوٹے زراعت پیشہ کے لیے آج دنیا کے عرصۂ حیات میں ہاتھ پاؤں مارنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ سب کے سب مجبور ہیں کہ معاشی کاروبار کے ان بادشاہوں کے غلام اور نوکر اور مزدور بن کر رہیں، اور یہ لوگ کم سے کم سامان زیست کے معاوضہ میں انکے جسم و دماغ کی ساری قوتیں اور ان کا سارا وقت لے لیتے ہیں جسکی وجہ سے پوری نوع انسانی بس ایک معاشی حیوان بنکر رہ گئی ہے۔ بہت کم خوش قسمت انسانوں کو اس معاشی کشمکش سے اتنی فرصت نصیب ہوتی ہے کہ اپنے اخلاقی، عقلی، روحانی ارتقاء کے لیے بھی کچھ کرسکیں، اور پیٹ بھرنے سے بالاتر بھی کسی مقصد کی طرف توجہ کرسکیں اور اپنی شخصیت کے اُن عناصر کو بھی نشو و نما دے سکیں جو تلاش معاش کے سوا دوسری پاکیزہ تر اغراض کے لیے خدا نے ان کے اندر ودیعت کیے تھے۔ درحقیقت اس شیطانی نظام کی بدولت معاشی کشمکش اس قدر سخت ہو جاتی ہے کہ زندگی کے تمام

دوسرے شعبے اس سے ماؤف و معطل ہو جاتے ہیں۔

انسان کی مزید بدنصیبی یہ ہے کہ دنیا کے اخلاقی فلسفے، سیاسی نظامات اور قانونی اصول بھی اس شیطانی نظام معیشت سے متاثر ہو گئے۔ مشرق سے مغرب تک ہر طرف اخلاقی معلمین کفایت شعاری پر زور دے رہے ہیں۔ جتنا کمانا اتنا ہی خرچ کر دینا ایک حماقت اور ایک اخلاقی عیب سمجھا جاتا ہے اور ہر شخص کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ اپنی آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کر کے بینک میں ڈپازٹ رکھے یا انشورنس پالیسی خریدے، یا کمپنیوں کے شیئرز حاصل کرے۔ گویا جو چیز انسانیت کو تباہ کرنے والی ہے وہی اخلاق کی نظر میں معیار خوبی بن گئی ہے۔ رہی سیاسی طاقت تو وہ عملاً بالکل ہی اس شیطانی نظام کے قبضہ میں آچکی ہے۔ وہ بجائے اسکے کہ اس ظلم سے انسان کو بچائے، ظلم کا آلہ کار بنی ہوئی ہے اور ہر طرف حکومت کی گدیوں پر شیطان کے ایجنٹ بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کے قوانین بھی اسی نظام کے زیر اثر مرتب ہو رہے ہیں۔ ان قوانین نے عملاً افراد کو پوری آزادی دے دی ہے کہ جس طرح چاہیں جماعت کے مفاد کے خلاف اپنی معاشی اغراض کے لیے جدوجہد کریں۔ روپیہ کمانے کے طریقوں میں جائز اور ناجائز کا امتیاز قریب قریب مفقود ہے۔ ہر وہ طریقہ جس سے کوئی شخص دوسروں کو لوٹ کر یا تباہ کر کے مالدار بن سکتا ہو، قانون کی نظر میں جائز ہے۔ شراب بنائیے اور بیچیے، بد اخلاقی کے اڈے قائم کیجیے، شہوانی فلم بنائیے، فحش مضامین لکھیے، جذبات کو بھڑکانے والی تصویریں شائع کیجیے، سٹے کا کاروبار پھیلائیے، سود خواری کے ادارے قائم کیجیے، قمار بازی کی نئی نئی صورتیں نکالیے، غرض جو چاہیے کیجیے، قانون نہ صرف آپکو اسکی اجازت دیگا، بلکہ الٹی آپکے حقوق کی حفاظت کریگا۔ پھر جو دولت اس طریقہ سے سمٹ کر ایک شخص کے پاس جمع ہو گئی ہو۔ قانون یہ چاہتا ہے کہ وہ اسکے مرنیکے بعد بھی ایک ہی جگہ سمٹی رہے۔ چنانچہ اولاد اکبر کے وارث ہونے کا طریقہ (Rule of primogeniture) اور بعض قوانین میں متبنّیٰ بنانے کا طریقہ، اور مشترک خاندان کا طریقہ (Joint family system)

اِن سب کی یہی غرض ہے کہ خزانہ کا ایک سانپ جب مرے تو دوسرا سانپ اس پر بٹھا دیا جائے، اور اگر بدقسمتی سے اُس سانپ نے کوئی سپولیا نہ چھوڑا ہو تو کہیں اور سے ایک سپولیا حاصل کیا جائے، تاکہ دولت کے اس سمٹاؤ میں فرق نہ آنے پائے۔

یہ اسباب ہیں جن سے نوعِ انسان کے لیے یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے کہ خدا کی اس زمین پر ہر شخص کو سامانِ زیست بہم پہنچنے کا انتظام کس طرح کیا جائے اور ہر شخص کو اپنی استعداد کے مطابق ترقی کرنے اور اپنی شخصیت کو نشو و نما دینے کے مواقع کیسے ملیں۔

اشتراکیت کا تجویز کردہ حل اس مسئلے کے حل کی ایک صورت اشتراکیت نے تجویز کی ہے، اور وہ یہ ہے کہ پیدائش دولت کے وسائل افراد کی ملکیت سے نکال کر جماعتی ملکیت بنا دیے جائیں، اور ضروریاتِ زندگی کو افراد پر تقسیم کرنے کا انتظام بھی جماعت ہی کے سپرد ہو۔ بظاہر یہ حل بہت معقول نظر آتا ہے لیکن اسکے عملی پہلوؤں پر آپ جس قدر غور کرینگے، اسی قدر آپ پر اس کے نقائص کھلتے چلے جائینگے، یہاں تک کہ آپکو تسلیم کرنا پڑیگا کہ آخر کار اسکے نتائج بھی اتنے ہی خراب ہیں جتنے اُس بیماری کے نتائج ہیں جسکا علاج کرنے کے لیے اسے اختیار کیا گیا ہے۔ یہ بالکل ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ وسائلِ پیدائش سے کام لینے اور پیداوار کو تقسیم کرنے کا انتظام خواہ نظری طور پر پوری جماعت کے حوالہ کر دیا جائے، مگر عملاً یہ کام ایک مختصر سی ہیئتِ انتظامیہ (Executive) ہی کے سپرد کرنا ہوگا۔ یہ مختصر گروہ ابتداءً جماعت (Community) ہی کا منتخب کردہ سہی، لیکن جب تمام ذرائعِ معاش اسکے قبضہ میں ہونگے اور اُسی کے ہاتھوں سے لوگوں تک پہنچ سکیں گے تو تمام آبادی اسکی مٹھی میں بے بس ہو جائیگی، اسکی رضا کے خلاف ملک میں کوئی دم تک نہ مار سکیگا، اور اسکے مقابلہ میں کوئی ایسی منظم طاقت ابھر ہی نہ سکے گی جو اُس کو منصبِ اقتدار سے ہٹا سکے۔ اُسکی نظر کسی سے پھر جانے کے معنی یہ ہونگے کہ وہ قصوروار بندہ اس سرزمین میں زندگی بسر کرنے کے تمام وسائل سے محروم

ہو جائے کیونکہ سارے وسائل پر اس مختصر گروہ کا تسلط ہوگا۔ مزدور میں اتنا یارا نہ ہوگا کہ اسکے انتظام سے ناراض ہو تو اسٹرائک کردے کیونکہ وہاں بہت سے کارخانہ دار نہ ہونگے کہ ایک کے در سے اٹھے تو دوسرے کے دروازے پر چلا جائے، بلکہ سارے ملک میں ایک ہی کارخانہ دار ہوگا۔ اور وہی حکمراں بھی ہوگا، اور اسکے خلاف کسی رائے عام کی ہمدردی بھی حاصل نہ کی جاسکیگی۔ اس طرح یہ صورت جس نتیجہ پر جاکر ختم ہوگی وہ یہ ہے کہ تمام سرمایہ داروں کو کھا کر ایک بڑا سرمایہ دار، تمام کارخانہ داروں اور زمینداروں کو کھا کر ایک بڑا کارخانہ دار و زمیندار لوگوں پر مسلط ہو جائے اور وہی بیک وقت زار اور قیصر بھی ہو۔

اول تو یہ اقتدار، اور ایسا مطلق اقتدار وہ چیز ہے جسکے نشہ میں بہک کر ظالم و جابر بننے سے رُک جانا انسان کے لیے بہت مشکل ہے، خصوصاً جبکہ وہ اپنے اوپر کسی خدا کا اور اسکے سامنے جواب دہی کا اعتقاد بھی نہ رکھتا ہو۔ تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ ایسے اقتدار مطلق پر قابض ہونے کے بعد بھی یہ مختصر گروہ آپے سے باہر نہ ہوگا اور عدل و انصاف ہی کے ساتھ کام کریگا تب بھی ایسے ایک نظام میں افراد کے لیے اپنی شخصیت کو نشو و نما دینے کا کوئی موقع نہیں ہوسکتا۔ انسانی شخصیت اپنے ارتقاء کے لیے سب سے بڑھ کر جس چیز کی محتاج ہے وہ یہ ہے کہ اُسے آزادی حاصل ہو، کچھ وسائل کار اسکے اپنے ہاتھوں میں ہوں جنہیں وہ اپنے اختیار سے استعمال کر سکے اور ان وسائل پر اپنے رجحان کے مطابق کام کرکے اپنی مخفی قوتوں کو ابھارے اور چمکائے۔ مگر اشتراکی نظام میں اسکا کوئی امکان نہیں۔ اس میں وسائل افراد کے اختیار میں نہیں رہتے بلکہ جماعت کی ہیئت انتظامیہ کے ہاتھوں میں چلے جاتے ہیں اور وہ ہیئت انتظامیہ جماعتی مفاد کا جو تصور رکھتی ہے اسی کے مطابق ان وسائل کو استعمال کرتی ہے۔ افراد کے لیے اسکے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اگر وہ ان وسائل سے استفادہ کرنا چاہیں تو اُس نقشہ کے مطابق کام کریں، بلکہ اُسی نقشہ کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالے جانے کے لیے ان منتظمین کے سپرد کر دیں جو انہوں نے جماعتی مفاد کے لیے تجویز کیا ہے۔ یہ چیز عملاً سوسائٹی کے

تمام افراد کو چند انسانوں کے قبضہ میں اس طرح دے دیتی ہے کہ گویا وہ سب بے روح مواد خام ہیں، اور جیسے چمڑے کے جوتے اور لوہے کے پرزے بنائے جاتے ہیں اس طرح وہ چند انسان مختار ہیں کہ ان بہت سے انسانوں کو اپنے نقشہ کے مطابق ڈھالیں اور بنائیں۔

انسانی تمدن و تہذیب کے لیے اس کا نقصان اس قدر زیادہ ہے کہ اگر بالفرض اس نظام کے تحت ضروریات زندگی انصاف کے ساتھ تقسیم بھی ہوں تو اسکا فائدہ اس نقصان کے مقابلہ میں ہیچ ہو جاتا ہے۔ تمدن و تہذیب کی ساری ترقی منحصر ہے اس پر کہ مختلف انسان جو مختلف قسم کی قوتیں اور قابلیتیں لیکر پیدا ہوتے ہیں، اُنکو پوری طرح نشو و نما پانے اور پھر اپنا اپنا حصہ اِس مشترک زندگی میں ادا کرنے کا موقع ملے۔ یہ بات ایسے نظام میں حاصل نہیں ہو سکتی جسکے اندر انسانوں کا پلاننگ (Planning) کیا جاتا ہو۔ چند انسان، خواہ وہ کتنے ہی لائق اور کتنے ہی نیک اندیش ہوں، بہر حال اتنے علیم و خبیر نہیں ہو سکتے کہ لاکھوں اور کروڑوں آدمیوں کی خلقی قابلیتوں اور ان کے فطری رجحانات کا صحیح اندازہ کر سکیں اور پھر انکے نشو و نما کا ٹھیک ٹھیک راستہ معین کر سکیں۔ وہ اس میں علم کے اعتبار سے بھی غلطی کرینگے، اور جماعتی مفاد یا جماعتی ضروریات کے متعلق جو تخمینہ انکے ذہن میں ہوگا اُسکے لحاظ سے بھی یہ چاہینگے کہ اُن کے زیر اثر انسانوں کی جتنی آبادی ہو وہ ان کے نقشہ پر ڈھال دی جائے۔ اس سے تمدن کی گوناگونی ختم ہو کر ایک بے روح یکسانی میں تبدیل ہو جائیگی۔ اِس سے تمدن کا فطری ارتقاء بند اور ایک طرح کا مصنوعی و جعلی ارتقاء شروع ہو جائیگا۔ اس سے انسانی قوتیں ٹھٹھرتی چلی جائینگی اور بالآخر ایک شدید اخلاقی و ذہنی انحطاط رونما ہوگا۔ انسان بہر حال چمن کی گھاس اور بیل بوٹے نہیں ہیں کہ ایک مالی انکو کانٹ چھانٹ کر کے مرتب کرے اور وہ اسی کے نقشے پر بڑھتے اور گھٹتے رہیں۔ ہر آدمی اپنا ایک تشخص رکھتا ہے جو اپنی فطری رفتار پر بڑھنا چاہتا ہے تم اسکی یہ آزادی سلب کروگے تو وہ تمہارے نقشہ پر نہیں بڑھیگا بلکہ بغاوت کریگا یا مرجھا کر رہ جائیگا

اشتراکیت کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ معاش کے مسئلہ کو مرکزی مسئلہ قرار دے کر پوری انسانی زندگی کو اسکے گرد گھما دیتی ہے۔ زندگی کے کسی مسئلہ پر بھی اسکی نظر مجرد تحقیقی نظر نہیں ہے، بلکہ سارے مسائل کو وہ ایک گہرے معاشی تعصب کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ مابعد الطبیعیات، اخلاق، تاریخ، سائنس، علوم عمران، غرض ہر چیز اسکے دائرہ میں معاشی نقطۂ نظر سے مغلوب و متاثر ہے اور اس یک رخے پن کی وجہ سے زندگی کا پورا توازن بگڑ جاتا ہے۔

فاشزم کا حل پس درحقیقت اشتراکی نظریہ انسان کے معاشی مسئلہ کا کوئی صحیح فطری حل نہیں ہے بلکہ ایک غیر فطری مصنوعی حل ہے۔ اسکے مقابلہ میں دوسرا حل فاشزم اور نیشنل سوشلزم نے پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ وسائل معیشت پر شخصی تصرف تو باقی رہے، مگر جماعتی مفاد کی خاطر اس تصرف کو ریاست کے مضبوط کنٹرول میں رکھا جائے۔ لیکن عملاً اسکے نتائج بھی اشتراکی نظریہ کے نتائج سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آتے۔ اشتراکیت کی طرح یہ نظریہ بھی فرد کو جماعت میں گم کر دیتا ہے اور اسکی شخصیت کے آزادانہ نشوونما کا کوئی موقع باقی نہیں چھوڑتا۔ مزید برآں جو ریاست اس شخصی تصرف کو قابو میں رکھتی ہے وہ اتنی ہی مستبد اور جابر و قاہر ہوتی ہے جتنی اشتراکی ریاست۔ ایک بڑے ملک کی تمام حرفت کو اپنے پنجۂ اقتدار میں رکھنے اور اپنے دیے ہوئے نقشہ پر کام کرنے کے لیے مجبور کرنا بڑی زبردست قوت قاہرہ چاہتا ہے اور جس ریاست کے ہاتھ میں ایسی قاہرانہ طاقت ہو اسکے ہاتھ میں ملک کی آبادی کا بے بس ہو جانا اور حکمرانوں کا غلام بنکر رہ جانا بالکل یقینی ہے۔

اسلام کا حل اب میں یہ بتاؤنگا کہ اسلام کس طرح اس مسئلے کو حل کرتا ہے۔

اسلام نے تمام مسائل حیات میں اس قاعدے کو ملحوظ رکھا ہے کہ زندگی کے جو اصول فطری ہیں انکو جوں کا توں برقرار رکھا جائے اور فطرت کے راستہ سے جہاں انحراف ہوا ہے وہیں سے اسکو موڑ کر فطرت کے راستہ پر ڈال دیا جائے۔ دوسرا اہم قاعدہ جس پر اسلام کی تمام اجتماعی اصلاحات

مبنی ہیں، وہ یہ ہے کہ صرف خارجی طور پر نظام تمدن میں چند ضابطے جاری کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ سب سے زیادہ زور اخلاق اور ذہنیت کی اصلاح پر صرف کیا جائے تاکہ نفس انسانی میں خرابی کی جڑ ہی کٹ جائے۔ تیسرا اساسی قاعدہ جس کا نشان آپکو تمام اسلامی نظام شریعت میں ملیگا، یہ ہے کہ حکومت کے جبر اور قانون کے زور سے صرف وہیں کام لیا جائے جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو۔ ان تین قاعدوں کو ملحوظ رکھ کر اسلام زندگی کے معاشی شعبے میں اُن تمام فطری اصولوں کو تسلیم کرتا ہے جن پر ہمیشہ انسانی معیشت کی بنیاد قائم رہی ہے، اور صرف اُن غلط اصولوں کو زیادہ سے زیادہ اخلاقی اصلاح اور کم سے کم حکومتی مداخلت کے ذریعہ سے مٹاتا ہے جو شیطانی اثر سے انسان نے اختیار کیے ہیں۔ یہ امر کہ انسان اپنی معاش کے لیے جدوجہد کرنے میں آزاد ہو، یہ بات کہ آدمی اپنی محنت سے جو کچھ حاصل کرے اُس پر اسے حقوق مالکانہ حاصل ہوں، اور یہ کہ انسانوں کے درمیان انکی قابلیتوں اور ان کے حالات کے لحاظ سے فرق و تفاوت ہو، ان سب چیزوں کو اسلام اُس حد تک تسلیم کرتا ہے جس حد تک یہ منشاء فطرت کے مطابق ہیں۔ پھر وہ ان پر ایسی پابندیاں عائد کرتا ہے جو انہیں حد فطرت سے متجاوز اور ظلم و بے انصافی کا موجب نہ بننے دیں۔

سب سے پہلے دولت کمانے کے سوال کو لیجیے۔ اسلام انسان کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ خدا کی زمین میں وہ خود اپنی طبیعت کے رجحان اور اپنی استعداد و قابلیت کے مطابق خود اپنی زندگی کا سامان تلاش کرے، لیکن وہ اس کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اپنی معاش حاصل کرنے کے لیے اخلاق کو خراب کرنے والے یا تمدن کے نظام کو بگاڑنے والے ذرائع اختیار کرے۔ وہ کسب معاش کے ذرائع میں حلال اور حرام کی تمیز قائم کرتا ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ چُن چُن کر ایک ایک نقصان رساں طریقہ کو حرام کر دیتا ہے۔ اسکے قانون میں شراب اور دوسری نشہ آور چیزیں اور فحش اور بد اخلاقی پھیلانے والی چیزیں نہ صرف بجائے خود حرام ہیں، بلکہ ان کا بنانا، بیچنا، خریدنا، رکھنا سب حرام ہے۔ وہ زنا، اور رقص و سرود، اور اسی قسم

سے دوسرے ذرائع کو بھی جائز ذرائع کسب معاش تسلیم نہیں کرتا۔ وہ ایسے تمام وسائل معیشت کو بھی ناجائز ٹھیراتا ہے جن میں ایک شخص کا فائدہ دوسرے لوگوں کے یا سوسائٹی کے نقصان پر مبنی ہو۔ رشوت، چوری، جُوا اور سٹہ، دھوکے اور فریب کے کاروبار، اشیاء ضرورت کو اس غرض سے روک رکھنا کہ قیمتیں گراں ہوں، معاشی وسائل کو کسی ایک شخص یا چند اشخاص کا اجارہ قرار دینا کہ دوسروں کے لیے جدوجہد کا دائرہ تنگ ہو، ان سب طریقوں کو اس نے حرام ٹھیرایا ہے۔ نیز کاروبار کی ایسی تمام شکلوں کو اس نے چھانٹ چھانٹ کر ناجائز قرار دیا ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے نزاع (Litigation) پیدا کرنے والی ہوں، یا جن میں نفع و نقصان بالکل بخت و اتفاق پر مبنی ہو یا جن میں فریقین کے درمیان حقوق کا تعین نہ ہو۔ اگر آپ اسلام کے اس تجارتی قانون کا تفصیلی مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آج جن طریقوں سے لوگ کروڑپتی اور ارب پتی بنتے ہیں، اُن میں سے بیشتر طریقے وہ ہیں جن پر اسلام نے سخت قانونی بندشیں عائد کردی ہیں۔ وہ جن وسائل کسبِ معاش کو جائز ٹھیراتا ہے ان کے دائرے میں محدود رہ کر کام کیا جائے تو اشخاص کے لیے بے اندازہ دولت سمیٹتے چلے جانے کا بہت کم امکان ہے۔

اب دیکھیے کہ جائز ذرائع سے جو کچھ انسان حاصل کرے اُس پر اسلام اُس شخص کے حقوق ملکیت تسلیم کرتا ہے، مگر اُسکے استعمال میں اسے بالکل آزاد نہیں چھوڑتا بلکہ اس پر بھی متعدد طریقوں سے پابندیاں عائد کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کمائی ہوئی دولت کے استعمال کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں: یا اُس کو خرچ کیا جائے۔ یا اُسے مزید نفع آور کاموں پر لگایا جائے۔ یا اُسے جمع کیا جائے۔ ان میں سے ایک ایک پر جو پابندیاں اسلام نے عائد کی ہیں، ان کی مختصر کیفیت میں یہاں بیان کرتا ہوں۔

خرچ کرنے کے جتنے طریقے اخلاق کو نقصان پہنچانے والے ہیں یا جن سے سوسائٹی کو نقصان پہنچتا ہے وہ سب ممنوع ہیں۔ آپ جُوے میں اپنی دولت نہیں اڑا سکتے۔ آپ شراب نہیں پی سکتے۔ آپ زنا نہیں کرسکتے۔ آپ گانے بجانے اور ناچ رنگ اور عیاشی کی دوسری

صورتوں میں اپنا روپیہ نہیں بہا سکتے۔ آپ ریشمی لباس نہیں پہن سکتے۔ آپ سونے اور جواہر کے زیورات استعمال نہیں کر سکتے۔ آپ تصویروں سے اپنی دیواروں کو مزین نہیں کر سکتے۔ غرض یہ کہ اسلام نے اُن تمام دروازوں کو بند کر دیا ہے جن سے انسان کی دولت کا بیشتر حصہ اسکی اپنی نفس پرستی پر صرف ہو جاتا ہے۔ وہ خرچ کی جن صورتوں کو جائز رکھتا ہے وہ اس قسم کی ہیں کہ آدمی بس ایک اوسط درجہ کی شستہ اور پاکیزہ زندگی بسر کر لے۔ اور اس سے زائد اگر کچھ بچتا ہو تو اسے خرچ کرنیکا راستہ اس نے یہ تجویز کیا ہے کہ اسے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں، رفاہِ عام میں، اور ان لوگوں کی امداد میں صرف کیا جائے جو معاشی دولت میں سے اپنی ضرورت کے مطابق حصہ پانے سے محروم رہ گئے ہیں اسلام کے نزدیک بہترین طرزِ عمل یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کمائے اسے اپنی جائز اور معقول ضرورتوں پر خرچ کر دے، اور پھر بھی جو بچ رہے اسے دوسروں کو دیدے تاکہ وہ اپنی ضرورتوں پر خرچ کریں۔ اس صفت کو اسلام نے بلند ترین اخلاق کے معیاروں میں داخل کیا ہے اور ایک آئیڈیل کی حیثیت سے اسکو اتنے زور کے ساتھ پیش کیا ہے کہ جب کبھی سوسائیٹی پر اسلامی اخلاقیات کا اثر غالب ہوگا، اجتماعی زندگی میں وہ لوگ زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جائینگے جو کمائیں اور خرچ کر دیں، اور ان لوگوں کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھا جائیگا جو دولت کو سمیٹ سمیٹ کر رکھنے کی کوشش کریں۔ یا کمائی ہوئی دولت کے بچے ہوئے حصے کو پھر کمانے کے کام میں استعمال کرنا شروع کر دیں۔

تاہم مجرد اخلاقی تعلیم کے ذریعہ سے، اور سوسائیٹی کے اخلاقی اثر اور دباؤ سے غیر معمولی حرص و طمع رکھنے والے لوگوں کی کمزوریوں کا بالکل استیصال نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود پھر بھی بہت سے ایسے لوگ باقی رہینگے جو اپنی ضرورت سے ز[illegible]ہ کمائی ہوئی دولت کو پھر مزید زائد از ضرورت دولت کمانے میں لگانا چاہینگے، اسلیے اسلام نے اسکے استعمال کے طریقوں پر چند قانونی پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ اس بچی ہوئی دولت کے استعمال کا یہ طریقہ کہ اسے سود پر چلایا جائے، اسلامی قانون میں قطعی حرام ہے۔

آپ اگر کسی کو اپنا مال قرض دیتے ہیں تو خواہ اس نے وہ قرض اپنی ضرورتوں پر خرچ کرنے کے لیے لیا ہو یا وسیلۂ معاش پیدا کرنے کے لیے، بہر حال آپ اس سے صرف اپنا اصل مال ہی واپس لینے کے حقدار ہیں، اس سے زائد ایک حبّہ لینے کا حق آپکو نہیں پہنچتا۔ اس طرح اسلام ظالمانہ سرمایہ داری کی کمر توڑ دیتا ہے اور اس سب سے بڑے ہتھیار کو کُند کر دیتا ہے جسکے ذریعہ سے سرمایہ دار محض اپنے سرمایہ کے بل پر آس پاس کی معاشی دولت سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ رہا فاضل دولت کے استعمال کا یہ طریقہ کہ اسے انسان خود اپنی تجارت یا صنعت و حرفت یا دوسرے کاروبار میں لگائے یا دوسروں کے ساتھ نفع و نقصان کا شریک ہو کر سرمایہ فراہم کرے، تو اسلام اسے جائز رکھتا ہے، اور اس سے جو زائد از ضرورت دولت اشخاص کے پاس سمٹ جاتی ہے اسکا علاج دوسرے طریقوں سے کرتا ہے۔

اسلام نے زائد از ضرورت دولت کے جمع کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ابھی میں کہہ چکا ہوں، اس کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ مال تمہارے پاس ہے اسے یا تو اپنی ضروریات خریدنے پر صرف کرو یا دوسروں کو دو کہ وہ اس سے اپنی ضروریات خریدیں اور اس طرح پوری دولت برابر گردش میں آتی رہے۔ لیکن اگر تم ایسا نہیں کرتے اور جمع کرنے ہی پر اصرار کرتے ہو تو تمہاری اس جمع کردہ دولت میں سے از روئے قانون ۲½ فی صدی سالانہ رقم نکلوالی جائیگی اور اسے اُن لوگوں کی اعانت پر صرف کیا جائیگا جو معاشی جدوجہد میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہیں، یا سعی و جہد کرنے کے باوجود اپنا پورا حصہ پانے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اسی چیز کا نام زکوٰۃ ہے اور اس کے انتظام کی صورت جو اسلام نے تجویز کی ہے وہ یہ ہے کہ اسے جماعت کے مشترک خزانہ میں جمع کیا جائے اور خزانہ ان تمام لوگوں کی ضروریات کا کفیل بن جائے جو مدد کے حاجت مند ہیں۔ یہ دراصل سوسائٹی کے لیے انشورنس کی بہترین صورت ہے، اور ان تمام خرابیوں کا استیصال کرتی ہے جو اجتماعی امداد و اعانت کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ سرمایہ داری نظام میں جو چیز انسان کو دولت جمع کرنے اور اسے نفع آور کاموں

میں لگانے پر مجبور کرتی ہے، اور جسکی وجہ سے لائف انشورنس وغیرہ کی ضرورت پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص کی زندگی اِس نظام میں اپنے ہی ذرائع پر منحصر ہے۔ بوڑھا ہو جائے اور کچھ بچا کر نہ رکھا ہو تو بھوکا مر جائے۔ بال بچوں کے لیے کچھ چھوڑے بغیر مرے تو وہ دربدر مارے مارے پھریں اور بھیک کا ٹکڑا تک نہ پا سکیں۔ بیمار ہو جائے اور کچھ بچا بچایا نہ رکھا ہو تو علاج تک نہ کر سکے۔ گھر جل جائے، یا کاروبار میں نقصان ہو یا کوئی اور آفت ناگہانی آجائے تو کسی طرف سے اسکو سہارا ملنے کی امید نہیں اسی طرح سرمایہ داری نظام میں جو چیز محنت پیشہ لوگوں کو سرمایہ داروں کا زرخرید غلام بن جانے، اور انکی شرائط کام کرنے کے لیے مجبور کرتی ہے وہ بھی یہی ہے کہ جو کچھ اسکی محنت کا معاوضہ سرمایہ دار دیتا ہے اسے لینا اگر غریب آدمی قبول نہ کرے تو فاقہ کرے اور ننگا پھرے۔ سرمایہ دار کی بخشش سے منہ موڑ کر اسے دو وقت کی روٹی میسر آنی مشکل ہے۔ پھر یہ لعنت کبریٰ جو آج سرمایہ داری نظام کی بدولت دنیا پر مسلط ہے کہ ایک طرف لاکھوں کروڑوں انسان حاجت مند موجود ہیں، اور دوسری طرف زمین کی پیداوار اور کارخانوں کی مصنوعات کے انبار لگے ہوئے ہیں مگر خریدے نہیں جا سکتے، حتیٰ کہ لاکھوں من گیہوں سمندر میں پھینکا جاتا ہے اور بھوکے انسانوں کے پیٹ تک نہیں پہنچتا، اس کا سبب بھی یہی ہے کہ حاجت مند انسانوں تک وسائل معیشت پہنچانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اُن سب کے اندر قوت خریداری پیدا کر دی جائے اور وہ اپنے حسب حاجت اشیاء خریدنے کے قابل ہو جائیں تو صنعت، تجارت، زراعت غرض ہر انسانی حرفت پھلتی پھولتی چلی جائے۔ اسلام زکوٰۃ اور بیت المال کے ذریعہ سے ان ساری خرابیوں کا استیصال کرتا ہے۔ بیت المال ہر وقت آپکی پشت پر ایک مددگار کی حیثیت سے موجود ہے۔ آپکو فکر فردا کی ضرورت نہیں۔ جب آپ حاجتمند ہوں بیت المال میں جائیے اور اپنا حق لے آئیے، پھر بنک ڈپازٹ اور انشورنس پالیسی کی کیا ضرورت؟ آپ اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر باطمینان تمام دنیا سے رخصت ہو سکتے ہیں۔ آپکے پیچھے جماعت کا خزانہ ان کا کفیل ہے۔ بیماری

بڑھاپے، آفات ارضی و سماوی، ہر صورتِ حال میں بیت المال وہ دائمی مددگار رہے جس کی طرف آپ رجوع کر سکتے ہیں۔ سرمایہ دار آپکو مجبور نہیں کر سکتا کہ آپ اسی کی شرائط پر کام کرنا قبول کریں۔ بیت المال کی موجودگی میں آپکے لیے فاقے اور برہنگی اور بے سایگی کا کوئی خطرہ نہیں۔ پھر یہ بیت المال سوسائٹی کے تمام اُن لوگوں کو اشیاء ضرورت خریدنے کے قابل بنا دیتا ہے جو دولت پیدا کرنے کے بالکل ناقابل ہوں یا کم پیدا کر رہے ہوں۔ اس طرح مال کی تیاری اور اسکی کھپت کا توازن پیہم قائم رہتا ہے، اور اسکی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ آپ اپنے دیوالیہ پن کو دنیا بھر کے سر چھپکنے کے لیے دوڑتے پھریں اور آخر کار دوسرے سیاروں تک پہنچنے کی حاجت پیش آئے۔

زکوٰۃ کے علاوہ دوسری تدبیر جو ایک جگہ سمٹی ہوئی دولت کو پھیلانے کے لیے اسلام نے اختیار کی ہے وہ قانونِ وراثت ہے۔ اسلام کے سوا دوسرے قوانین کا رجحان اس طرف ہے کہ جو دولت ایک شخص نے زندگی بھر سمیٹی ہے وہ اسکے مرنے کے بعد بھی سمٹی رہے۔ مگر اسلام اسکے برعکس یہ طریقہ اختیار کرتا ہے کہ جس دولت کو ایک شخص سمیٹ سمیٹ کر قید کرتا رہا ہے، اسکے مرتے ہی وہ پھیلا دی جائے۔ اسلامی قانون میں بیٹے، بیٹیاں، باپ، ماں، بیوی، بھائی، بہن، سب ایک شخص کے وارث ہیں اور ایک ضابطہ کے مطابق سب پر میراث تقسیم ہونی ضروری ہے۔ قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں تو دور پرے کے رشتہ دار تلاش کیے جائینگے اور ان میں یہ دولت پھیلائی جائیگی۔ کوئی رشتہ دار سرے سے موجود ہی نہ ہو، تب بھی آدمی کو متبنیٰ بنانے کا حق نہیں ہے۔ اس صورت میں اسکی وارث پوری جماعت ہے۔ اسکی سمیٹی ہوئی تمام دولت بیت المال میں داخل کر دی جائیگی۔ اس طرح خواہ کوئی شخص کروڑوں اور اربوں کی دولت جمع کر لے، اُسکے مرنے کے بعد دو تین پشتوں کے اندر وہ سب کی سب چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر پھیل جائیگی، اور دولت کا ہر سمٹاؤ بتدریج پھیلاؤ میں تبدیل ہو کر رہیگا۔

یہ نظام معیشت جس کا نہایت مختصر سا نقشہ میں نے پیش کیا ہے اس پر غور کیجیے - کیا یہ شخصی ملکیت کے ان تمام نقصانات کو دور نہیں کر دیتا جو شیطان کی غلط تعلیم کے سبب سے رونما ہوتے ہیں؟ پھر آخر اس کی کیا حاجت ہے کہ ہم اشتراکی نظریے، یا فاشزم اور نیشنل سوشلزم کے نظریات کو اختیار کر کے معاشی انتظام کے وہ مصنوعی طریقے اختیار کریں جو ایک خرابی کو دور نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ دوسری خرابی پیدا کر دیتے ہیں؟ یہاں میں نے اسلام کے پورے نظام معاشی کو بیان نہیں کیا ہے - زمین کے انتظام اور کاروباری نزاعات (Trade disputes) کے تصفیہ، اور صنعت و حرفت کے لیے سرمایہ کی فراہمی کی جو صورتیں اسلام کے اصول پر اختیار کی جا سکتی ہیں اور جن کے لیے قانونِ اسلام میں پوری گنجائش رکھی گئی ہے انہیں اس مختصر مقالہ میں پیش کرنا مشکل ہے - نیز اسلام نے جس طرح درآمد و برآمد کے محصولات اور اندرون ملک میں اموال تجارت کی نقل و حرکت پر چنگی کی پابندیوں کو اڑا کر اشیاء ضرورت کے آزاد مبادلہ کا راستہ کھولا ہے اس کا ذکر بھی میں نہیں کر سکا ہوں - ان سب سے بڑھ کر مجھے یہ بیان کرنے کا موقع بھی نہیں ملا ہے کہ ملکی انتظام اور سول سروس اور فوج کے مصارف کو انتہائی ممکن حد تک گھٹا کر، اور عدالت سے اسٹامپ ڈیوٹی کو قطعی طور پر ہٹا کر اسلام نے سوسائٹی پر سے جس عظیم الشان معاشی بوجھ کو ہلکا کیا ہے، اور ٹیکسوں کو انتظام کے حد سے بڑھے ہوئے مصارف میں کھپا دینے کے بجائے سوسائٹی کی آسائش اور بہتری پر صرف ہونے کے جو مواقع پیدا کیے ہیں ان کی بدولت اسلام کا معاشی نظام انسان کے لیے کتنی بڑی رحمت بن جاتا ہے - اگر تعصب چھوڑ دیا جائے، اور آباؤ اجداد سے جو جاہلانہ تنگ نظری وراثت میں ملی ہے، یا غیر اسلامی نظامات کے دنیا پر غالب آجانے سے جو مرعوبیت دماغوں پر چھا گئی ہے اسے دور کر کے آزاد تحقیق کی نگاہ سے اس نظام کا مطالعہ کیا جائے، تو میں توقع کرتا ہوں کہ ایک بھی معقول اور منصف مزاج آدمی ایسا نہ ملے گا جو انسان کی معاشی فلاح کے لیے اس نظام کو سب سے زیادہ مفید، صحیح، فطری اور

معقول تسلیم نہ کرے۔

لیکن اگر کسی شخص کے ذہن میں یہ غلط فہمی ہو کہ اسلام کے پورے اعتقادی، اخلاقی، تمدنی مجموعہ میں سے صرف اسکے معاشی نظام کو لیکر کامیابی کے ساتھ چلایا جا سکتا ہے تو میں عرض کرونگا کہ براہِ کرم وہ اس غلط فہمی کو دل سے نکال دے۔ اس معاشی نظام کا گہرا ربط اسلام کے سیاسی، عدالتی و قانونی اور تمدنی و معاشرتی نظام کے ساتھ ہے۔ پھر اِن سب چیزوں کی بنیاد اسلام کے نظام اخلاق پر قائم ہے اور وہ نظام اخلاق بھی اپنے آپ پر قائم نہیں ہے بلکہ اسکے قیام کا پورا انحصار اس پر ہے کہ آپ ایک عالم الغیب قادر مطلق خدا پر ایمان لائیں اور اپنے آپ کو اسکے سامنے جواب دہ سمجھیں، موت کے بعد آخرت کی زندگی کو مانیں اور آخرت میں عدالت الٰہی کے سامنے اپنے پورے کارنامۂ حیات کے جانچے جانے اور اس جانچ کے مطابق جزا و سزا پانے کا یقین رکھیں، اور یہ تسلیم کریں کہ خدا کی طرف سے محمد رسول اللہ نے جو ضابطۂ اخلاق وقانون آپ تک پہنچایا ہے جس کا ایک جزء یہ معاشی نظام بھی ہے، وہ بے کم و کاست خدا ہی کی ہدایت پر مبنی ہے۔ اگر اس عقیدے اور اس نظام اخلاق اور اس پورے ضابطۂ حیات کو آپ جوں کا توں نہ لینگے تو نرا اسلامی نظام معاشی ایک دن بھی اپنی صحیح اسپرٹ کے ساتھ نہ چل سکیگا اور نہ اس سے آپ کوئی معتدبہ فائدہ اٹھا سکینگے۔

رسائل و مسائل

رفع شبہات

[حال میں ہندوستان کے ایک مشہور عالم اور صاحب دل بزرگ کا ایک گرامی نامہ آیا تھا جس میں میرے خیالات اور طریق کار کے متعلق چند شبہات کا اظہار کیا گیا تھا۔ جواب میں جو کچھ میں نے لکھا اس میں چونکہ اکثر وہ شبہات زیر بحث آگئے ہیں جو آجکل بعض حلقوں کی طرف سے پھیلائے جا رہے ہیں اسلیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی ترمیم کے ساتھ اسے یہاں نقل کر دیا جائے۔ اصل مکتوب جسکے جواب میں یہ نیاز نامہ لکھا گیا ہے شائع نہیں کیا جاسکتا کیونکہ صاحب مکتوب نے اسکی اجازت نہیں دی، مگر میرے جواب سے شبہات کی نوعیت بآسانی معلوم کی جاسکتی ہے]

مولانا المکرم   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

آپ نے جن شبہات کا اظہار فرمایا ہے انہیں دیکھ کر مجھے شبہ ہوتا ہے کہ شائد آپکی نظر سے میری وہ تحریریں نہیں گذری ہیں جو ماضی قریب میں نکلتی رہی ہیں، اسی وجہ سے بہت سے وہ شبہات آپکے قلب مبارک میں پیدا ہو گئے ہیں جو دوسروں کی زبان سے میرے خیالات کی ترجمانی سُن کر اکثر بزرگوں کے دلوں میں پیدا ہو رہے ہیں۔ آپ جیسے عدیم الفرصت حضرات سے میرا یہ مطالبہ غالباً بیجا ہو گا کہ آپ میری ان تحریروں کو بالاستیعاب ملاحظہ فرمائیں۔ مگر یہ گوارا کرنا بھی میرے لیے مشکل ہے کہ لوگوں کی غلط ترجمانی کی بدولت وہ چند صالح و برگزیدہ اصحاب بھی مجھ سے بدگمان ہو جائیں جنکی دعاؤں

کے ساتھ جنگی عملی تائید و اعانت کا بھی میں محتاج ہوں - لہذا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مختصراً اپنے خیالات کی ترجمانی میں خود ہی کر دوں اور پھر آپ سے دریافت کروں کہ اب کس شبہ کی گنجائش رہتی ہے -

۱- میرے نزدیک یہ ایسا وقت دنیا پر آیا ہے جبکہ ایک دور ختم ہوتا ہے اور دوسرے دور کی بنیاد پڑتی ہے - مغربی تہذیب اور اسکی اساس پر کام کرنے والوں کو جتنا موقع مشیت الٰہی کے تحت مل سکتا تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پورا ہو چکا ہے یا پورا ہونے کے قریب آ لگا ہے - اب یہ سارا نظام درہم برہم ہونا شروع ہو گیا ہے اور ایک دوسرا نظام بننے سے پہلے جو اضطرابی کیفیات لازماً طاری ہوا کرتی ہیں اُن کا آغاز ہو چکا ہے - اگرچہ اقامتِ دینِ حق کی کوشش ہر زمانہ میں اہلِ ایمان پر فرض ہے، مگر خصوصیت کے ساتھ ایسے وقت میں جبکہ دنیا حاضر الوقت نظامات سے تلخ تجربات کی بنا پر مایوس ہوتی جا رہی ہے اور کسی دوسرے نظام کے قائم ہونے کے لیے زمین ہموار ہو رہی ہے، دینِ حق کے قیام کی کوشش کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہے - جو مواقع اسوقت پیدا ہو گئے ہیں، اگر اُن سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ہم نے نہ کی تو ہم سے سخت باز پرس ہوگی -

۲- لیکن مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ مشرق سے مغرب تک مسلمان بالعموم محض وقتی اور مقامی مسائل اور چھوٹے چھوٹے معاملات میں الجھے ہوئے ہیں اور دنیا کے وسیع میدان میں ادیانِ باطلہ کے تصادم سے دینِ حق کے قیام کا جو موقع نکل آیا ہے اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا - ہر جگہ ان کے چھوٹے اور بڑے گروہ یا تو اپنے اپنے ملکی اور قومی معاملات سلجھانے میں لگے ہوئے ہیں، یا اگر کچھ مذہبی فکر ہے بھی تو وہ اس سے زیادہ نہیں کہ کسی دینِ باطل کے ظلِ عاطفت میں انکو کچھ مذہبی حقوق حاصل ہو جائیں - دنیا میں اس بات پر کشمکش برپا ہے کہ ملک کس کا ہے، اور دین کس کا چلے - ہر طرف سے مختلف مدعی دعوے لے لے کر اٹھ رہے ہیں کہ ملک ہمارا ہے اور دین ہمارا چلنا چاہیے - مگر روئے زمین کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک کوئی یہ دعویٰ لیکر اٹھنے والا

نظر نہیں آتا کہ ملک سوائے خدا کے اور کسی کا نہیں ہے، اور صرف خدا ہی کے دین کو یہ حق پہنچتا ہے کہ زمین پر اسکا سکہ رواں ہو۔ دنیا میں ہر دعوے کے لیے مارنے والے بھی موجود ہیں اور مرنے والے بھی۔ ہر مقصد کے لیے چوٹیں کھانے اور نقصان اٹھانے والے پائے جاتے ہیں۔ مگر خدا کی زمین پر کوئی نہیں جو خدا کی حاکمیت کے دعوے پر مارنے یا مرنے والا ہو اور خدا کے دین کو چلانے کے لیے چوٹ کھانے اور نقصان اٹھانے پر آمادہ ہو۔

۳۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اقامتِ دینِ حق کی کوشش کرنے کے لیے اگر کوئی گروہ اٹھ سکتا ہے تو انہی لوگوں میں سے اٹھ سکتا ہے جو آپکے بقول "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے علم کی تصحیح کا ذریعہ بنانے اور مرضیِ الٰہی کا نمائندہ قرار دینے" والے ہیں۔ لیکن اِس کارِ عظیم کے لیے محض اِس چیز کا اعتقاد یا صرف اپنے ذاتی عمل کی حد تک ہی اسکی پیروی کافی نہیں ہے۔ یہ کام ایسی ایک جماعت چاہتا ہے جو اس معاملہ میں اتنی پُر زور ہو، اتنی شدید ہو کہ دوسروں کو بھی اِسی عقیدے اور عمل کی طرف کھینچ کر لاسکے اور اس داعیہ کے ساتھ اٹھ سکے کہ وہ دنیا کے برسرِ عمل ہونے والے نظام کو کسی دوسری اساس پر قائم نہ ہونے دیگی بلکہ اپنے یقین و ایمان اور اپنے عمل وجہاد کی طاقت سے اُسے دینِ حق کی اساس پر قائم ہونے کے لیے مجبور کر دے گی۔

۴۔ ایسی جماعت کی فراہمی دو ہی صورتوں سے ممکن ہے۔ یا وہ اُن مسلمانوں میں سے آئیگی جو پہلے سے مذکورہ بالا امور کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ یا اُن لوگوں میں سے آئیگی جو اب اس اعتقاد کو قبول کریں۔ لیکن عملاً دوسرے گروہ میں سے بھرتی ہونا اُس وقت تک مشکل ہے جب تک کہ پہلے گروہ میں سے ایک معتد بہ جماعت ایسی پیدا نہ ہو جائے جو مجرد اِس عقیدے، یا اس کے مطابق ذاتی عمل پر اکتفا کرنے والی نہ ہو بلکہ اسی عقیدہ کو پھیلانے اور اسی پر دنیا کا نظام قائم کرنے کے لیے مجاہدہ پر آمادہ ہو جائے۔ اسی لیے ہم نے غیر مسلموں سے پہلے مسلمانوں سے خطاب کیا ہے۔

۵- عام مسلمانوں کے متعلق میرا بھی وہی خیال ہے جو آپکا ہے ۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ "وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی مرضی کا نمائندہ اُسی طریقہ سے مانتے ہیں جیسے ایک مومن کو ماننا چاہیے"۔ میں نے یہ کبھی نہیں کہا اور نہ کبھی یہ گمان کیا کہ "انکے قلوب میں نبوت محمدی کا انکار پیدا ہو چکا ہے" لیکن جب میں اقامتِ دین کے مقصد کو سامنے رکھ کر ان مسلمانوں پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس مرتبے کے ایمان و یقین اور جس مرتبے کے عمل پر یہ اکتفا کیے ہوئے ہیں وہ اس مقصد کے لیے کافی نہیں ہے ۔ علاوہ بریں انہی مسلمانوں میں آخر وہ لوگ بھی تو ملے جُلے موجود ہیں جو مبادی دین تک سے ناواقف ہیں اور مسلمان ہونے کے باوجود بدترین اعتقادی و عملی گمراہیوں میں صرف مبتلا ہی نہیں ہیں بلکہ اُن پر اس قدر جمے ہوئے ہیں کہ انہیں راہِ راست پر لانا کسی غیر مسلم کو مسلمان بنانے سے کچھ کم مشکل نہیں ہے ۔ ان میں وہ بھی تو ہیں جو اعتقاداً مسلمان ہونے کے باوجود ہوائے نفس کو اپنا الٰہ بنائے ہوئے ہیں اور اُس معیارِ ردّو قبول، ترک و اختیار، پسندیدگی و ناپسندیدگی کو اپنانے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں جو محمد رسول اللہؐ نے پیش کیا ہے ۔ محمد رسول اللہؐ کے نزدیک جو کچھ قابلِ قدر ہے وہ اُنکے نزدیک ناقابلِ قدر ہے اور جسے حضور منکر اور مردود قرار دیتے ہیں وہی انکی نگاہ میں معروف اور مقبول بلکہ عین مطلوب ہے ۔ ان میں وہ بھی تو ہیں جو اسلام کے عقیدتمند بھی بنتے ہیں اور پھر شریعت اسلام کے نفاذ کو نہ صرف غیر ممکن سمجھتے ہیں بلکہ یہ رائے رکھتے ہیں کہ چوری پر قطع ید اور زنا پر ضرب تازیانہ اور رجم اور سود کی تحریم اور اسی قسم کے قوانین موجودہ زمانہ کے لیے موزوں نہیں ہیں ۔ ان میں وہ بھی تو ہیں جو مجملاً اسلام کو حق مانتے اور کہتے ہیں مگر الٰہیات، اخلاق، تمدن، سیاست، معیشت ہر چیز کی تفصیلات میں عقیدہ اور مسلک دونوں کے اعتبار سے غیر اسلامی نظریات ہی کے پیرو ہیں ۔ ان میں وہ بھی تو ہیں جو خدا اور رسالت اور آخرت کا یقین نہیں رکھتے بلکہ شک اور تذبذب میں مبتلا ہیں ۔ وہ بھی ہیں جو خدا اور رسول اور فرشتوں، اور جنت و دوزخ، سب کے منکر ہیں اور صرف منکر ہی نہیں ہیں

بلکہ ان عقائد کا اور روزہ و نماز کا استہزاء کرنے سے بھی باز نہیں آتے - وہ بھی ہیں جو تمام ضروریات دین کا اقرار کرتے ہیں اور ارکان کے پابند بھی ہیں مگر دنیا کی طمع سے اس درجہ مغلوب ہیں کہ متاع قلیل کے معاوضہ میں دین کے خلاف جو خدمت بھی ان سے لی جائے اور جس غداری و ایمان فروشی کا بھی ان سے مطالبہ کیا جائے، طوعاً یا کرہاً اسے بجا لانے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں - وہ بھی ہیں جو دین کے منکر تو نہیں ہیں مگر مقر بھی نہیں ہیں انہیں اس سے کچھ بحث ہی نہیں ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا - ان کی غایت مقصود بس یہ ہے کہ اپنے نفس و بدن کے مطالبات پورے کریں اور اس فکر میں وہ ایسے منہمک ہیں کہ ہر دوسری چیز سے غافل ہو چکے ہیں - ان تمام اقسام کے لوگ عام مسلمانوں میں شامل ہیں اور کچھ اس طرح خلط ملط ہو گئے ہیں کہ اس مجموعہ کے اندر یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ کون کس قسم کا "مسلمان" ہے -

۶- اب یہ ظاہر ہے کہ اگر اقامتِ دین کے لیے کوئی کوشش کرنی ہے تو اس پورے مجموعہ کو وہ "بنی بنائی اسلامی جماعت" قرار نہیں دیا جا سکتا جسے لیکر مجاہدہ شروع کر دیا جائے - قومی اغراض کی خدمت کرنے والی جماعتوں کے لیے تو یہ ضرور ممکن ہے کہ ایک پروگرام سامنے رکھیں اور تمام مسلمانوں کو پکار دیں کہ آؤ چار چار آنے یا دو دو آنے فیس دیکر رکنیت کے فارم بھر دو اور "ملت" کی فوج میں بھرتی ہو جاؤ - وہ ہر قسم کے رطب و یابس جمع کر سکتی ہیں اور ان کا کام اس طرح چل بھی سکتا ہے - لیکن ہم جس مقصد کے لیے ایک جماعت کی تنظیم کرنا چاہتے ہیں اسکے لیے یہ اجتماعِ شتر و گربہ کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا بلکہ یقیناً سخت نقصان دہ ہوگا - لامحالہ ہمیں مسلمانوں کے اس مخلوط انبوہ میں سے صرف صالح لوگوں کو الگ چھانٹ کر منظم کرنا پڑیگا، اور صالحین کو چھانٹنے کی کوئی صورت بجز اسکے نہیں ہے کہ اسلام کے خالص عقیدے، اور حکومت الٰہیہ کے نصب العین اور شریعت کے اخلاقی و قانونی ضوابط کو مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے اور ان میں سے جو لوگ اس عقیدے کا اقرار اور ان ضوابط کی پابندی کو قبول کریں اور اس نصب العین کو اپنی زندگی کا نصب العین بنانے کے لیے تیار ہوں صرف

انہی کو جماعت میں لیا جائے۔ میں ایک مدت دراز تک شب و روز اس بات پر غور کرتا رہا ہوں کہ مختلف النوع "مسلمانوں" کا یہ مخلوطہ جو بدقسمتی سے بن گیا ہے اس میں سے حقیقی مسلمانوں کو کس طرح چھانٹا جائے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سوچ سوچ کر تھک جانے کے باوجود مجھے اس تدبیر کے سوا کوئی دوسری تدبیر نظر نہیں آئی۔ اگر آپ یا کوئی دوسرے بزرگ کوئی اور طریقہ بتا سکیں تو ضرور بتائیں۔

۷- میرا اصل مدعا اقامت دین کی جدوجہد کے لیے صالح آدمی چھانٹنا ہے نہ کہ مسلمانوں کے کفر و ایمان کی بحث چھیڑنا۔ مسلمانوں کی موجودہ ایمانی و اخلاقی حالت پر جو تنقیدیں میں نے کی ہیں ان سے بھی میرا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ دعوت الی اللہ کے مقصد عظیم کا اعتبار کرتے ہوئے مسلمانوں میں اس وقت کیا کیا کوتاہیاں پائی جاتی ہیں اور یہ کہ اس کار خطیر کے لیے مسلمانوں کے اس مجموعہ میں سے کس قسم کے لوگ مناسب اور مطلوب ہیں۔ جماعت اسلامی کے دستور میں شہادتین کو شرطِ رکنیت قرار دینے کی غرض بھی صرف یہ ہے کہ جو لوگ اس کام کے لیے اپنے آپ کو پیش کریں ان کے متعلق یہ اطمینان کر لیا جائے کہ وہ صالح العقیدہ ہیں اور جاہلیت کی اُن آمیزشوں کو لیے ہوئے نہیں آرہے ہیں جو بدقسمتی سے مسلمانوں کے اندر گھس آئی ہیں، نیز یہ کہ دعوت الی اللہ کی خدمت شروع کرنے سے پہلے وہ ایک مرتبہ پھر اللہ کے ساتھ اپنے عہد و میثاق کو استوار کر لیں اور نو مسلمانہ جوش کے ساتھ کام کے لیے آگے بڑھیں[1]۔ میرے اس مقصد کو لوگوں نے نہیں سمجھا اور بعض ہوشیار لوگوں نے قصداً

[1] بعض لوگ شرکت جماعت کے لئے تجدید ایمان کی شرط پر بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ علماء اور مشائخ اور معروف و مشہور اہل ایمان کے لیے اس شرط پر زور دینے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ اگر بعض مسلمانوں سے تجدید ایمان کرائی جائے اور بعض سے نہ کرائی جائے تو جن سے کرائی جائیگی وہ یہ نہ کہینگے کہ کیا ہم کافر تھے جو اب ہم سے شہادت ادا کرائی جاتی ہے؟ علاوہ بریں اقامت دین کے لیے جدوجہد کے میدان میں قدم رکھتے وقت پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ شہادت توحید و رسالت

(بقیہ صـ۱۸۹ پر ملاحظہ ہو)

بھی اسکے متعلق غلط فہمیاں پھیلائیں - اس وجہ سے جن بزرگوں کو میری تحریرات کے تفصیلی مطالعہ کا موقع نہیں ملا ہے، اور جن تک میری بات مفسروں کی تحریفات کے واسطہ سے پہنچی ہے انہیں یہ غلط فہمی ہو گئی کہ میں "مسلمانوں کو ایمان و یقین سے خالی" قرار دے رہا ہوں، اور انکو "دین کے دائرے سے باہر دھکیل کر پھر انکو اندر بلانے کی دعوت" دیتا ہوں، اور یہ کہ "جس توپ خانہ کا دہانہ کفر کی طرف کھولا گیا تھا اسے اہل ایمان پر کھولنا" چاہتا ہوں - اللہ شاہد ہے کہ میں ان سب باتوں سے بری ہوں -

۸ - میرے نزدیک اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جو جماعت یہ مقصد لیکر اٹھے وہ لوگوں کو صرف اللہ کے راستہ کی طرف بلائے، اس دعوت کے ساتھ اپنے دنیوی مقاصد اور سیاسی و معاشی حقوق اور ذاتی یا قومی مفادات کی بحث کو خلط ملط نہ کر دے - اگر ہم دعوت الی اللہ کے ساتھ یہ آوازیں بھی بلند کرینگے تو ہماری دعوت کا قطعاً کوئی اثر نہ ہوگا - خصوصاً اگر ہم نے محض قومی عصبیت کی بنا پر مسلمانوں کے اُن کاموں کی حمایت کی جو اسلام کی راہِ راست سے ہٹے ہوئے ہیں تو یقیناً ہماری یہ حرکت دنیا کو اسلام سے قریب لانے کے بجائے اور زیادہ دور پھینک دیگی -

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۱) ادا کرنے ہیں جو ایک انقلاب انگیز کیفیت ہے اسکی اہمیت کو یہ لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں - میرا ذاتی تجربہ ہے اور جماعت اسلامی کے پہلے اجتماع میں جو لوگ شریک ہوئے تھے ان سب پر یہ گذری ہوئی بات ہے کہ اس طرح کلمۂ شہادت ادا کرتے ہوئے آدمی اس احساس سے لرز اٹھتا ہے کہ وہ کتنی بڑی بات کا اقرار کر رہا ہے - اس وقت وہ اس قولِ ثقیل کا پورا بوجھ محسوس کرتا ہے اور ہم نے دیکھا ہے کہ بہت سے لوگوں کی زندگی میں اسی اقرار کے ساتھ ایک انقلاب شروع ہو گیا ہے - مگر افسوس کہ فقیہانہ و متکلمانہ موشگافیوں کی عادت نے لوگوں کو ان لطیف کیفیات کے ادراک سے محروم کر دیا ہے - اور کچھ نہیں تو کم از کم ان لوگوں کو یہی سوچنا چاہیے کہ جب نماز میں روزانہ بیس دفعہ اور اذان میں روزانہ پانچ دفعہ یہ شہادتین ادا کرتے ہیں تو اپنی دینی زندگی کا ایک نیا دور شروع کرتے ہوئے یہی اقرار کر لینے میں آخر کیا قباحت ہے - کیا اللہ کی توحید اور اسکے نبی کی رسالت پر چند مسلمانوں کے سامنے گواہی دینا کوئی ایسا بُرا فعل ہے کہ اس سے انکی توہین ہو جاتی ہے؟

اسلیے میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ اگر تم کو وہ کام کرنا ہے جس کے لیے تم ایک امت بنائے گئے ہو (کنتم خیر امۃ اخرجت للناس الآیہ) تو تمام ذاتی اور قومی مفادات سے بے پروا ہو کر لوگوں کو صرف اللہ کے راستہ کی طرف بلاؤ۔ اور اگر تم اپنے مفادات سے قطع نظر نہیں کر سکتے اور انہی کے لیے جد و جہد کرنا چاہتے ہو تو پھر اس غلط فہمی کو اپنے دل سے نکال دو کہ ان کاموں کے ساتھ تم دعوت الی اللہ کا کام بھی کر سکو گے۔ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ نہیں نبھ سکتیں۔ ایک کو اختیار کرنے کے لیے دوسری کو چھوڑنا ہی پڑیگا۔ میرے اس مشورہ پر یہ خطرہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس طرح تو جو کچھ مسلمانوں کے پاس رہا سہا ہے وہ بھی جاتا رہیگا۔ مگر میں پورے اطمینان قلب کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ خدا کی طرف بلانے والے گروہ کو اس سے بالکل بے نیاز ہو کر کام کرنا چاہیے کہ اسکے پاس کیا رہیگا اور کیا اسکے ہاتھ سے چلا جائیگا۔ یہ دعوت صرف وہی لوگ دے سکتے ہیں جو فکر مآل سے بالاتر ہو کر کام کریں اور ایک خدا کو پانے کے لیے سب کچھ کھو دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مسلمان اس طرح سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر خالصۃً لوجہ اللہ کام کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو خواہ ابتدائً سب کچھ ان کے ہاتھ سے نکل جائے، مگر آخر کار وہ سب کچھ ان کے قدموں میں آ رہیگا جسکو یہ کھوئینگے، بلکہ اس سے بڑھ کر وہ کچھ انہیں حاصل ہوگا جسکے حصول کا خواب بھی یہ آج نہیں دیکھ سکتے۔ جو گروہ صرف اللہ کے لیے کام کرے اور چھوٹی چھوٹی چیزوں سے نظر ہٹا کر اپنی نگاہ بلندترین نصب العین پر جما دے بھلا اُس کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی طاقت ٹھیر سکتی ہے؟ مگر افسوس کہ مسلمانوں کے حوصلے اس اولوالعزمی کے لیے تنگ ہیں۔ ان کو اور سب تدبیروں میں تو امید کی شعاعیں جھلکتی نظر آتی ہیں، مگر اس کام میں وہ موت اور ہلاکت کے سوا کچھ نہیں دیکھتے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ راہ اختیار کی اور بس ساری تباہیاں اور بربادیاں ان پر یک بارگی حملہ کر دینگی اور وہ دنیا میں کہیں کے نہ رہینگے۔ رہی آخرت تو اسکی فکر ہی کسے ہے۔

یہ وہ جرم ہے جسکی بنا پر مجھے الزام دیا جا رہا ہے کہ تو مسلمانوں کے مفاد کا دشمن ہے اور چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس جو کچھ رہا سہا ہے وہ بھی چلا جائے۔

۹۔ اصولاً دعوت الی اللہ کے کام کی آج بھی وہی نوعیت ہے، جو پہلے تھی۔ یعنی غیر اللہ کی ربوبیت وحاکمیت تسلیم کرنے سے علی الاعلان انکار اور صرف رب العالمین کی ربوبیت وحاکمیت تسلیم کرنے کی طرف دعوتِ عام۔ یہی ہم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سنیا گرہی نہیں ہیں۔ جیل جانا ہمارا پروگرام نہیں ہے ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ خواہ مخواہ ہم پکڑے ہی جائیں، پیٹے ہی جائیں، ریت پر گھسیٹے ہی جائیں۔ اگر کوئی اس دعوت میں ہماری مزاحمت نہ کرے اور حاکمیت غیر اللہ کے ابطال کو برداشت کرے یا سیدھی طرح ہماری اس دعوت کو قبول کرنے تو چشم ما روشن دلِ ماشاد۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ اس چیز کو ٹھنڈے پیٹوں کبھی گوارا نہیں کیا گیا ہے اور نہ آج گوارا کیا جائیگا۔ جب مسلمان ہی یہ آواز سن کر بگڑ کھڑے ہوتے ہیں تو دوسروں سے ہم کیونکر توقع کر سکتے ہیں کہ وہ اسے برداشت کر لینگے۔ اسلیے ہمیں یقین ہے کہ اس دعوت کے بلند کرنے پر آج بھی وہی کچھ پیش آکر رہیگا جو کل مکّہ میں پیش آیا تھا۔ اسی مشابہت کی بنا پر ہم اپنے موجودہ حال کو زمانۂ قبل ہجرت سے تشبیہ دیتے ہیں مگر آپکا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ "جب تم اسے مکّی زندگی کہتے ہو تو پھر تمام حیثیات سے وہی پروگرام رکھو جو مکّہ میں تھا اور مدنیت کو اپنے پروگرام سے خارج کردو"۔ یہ رائے اسلیے غیر صحیح ہے کہ مکہ میں تو سب کفار ہی کفار تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل ابتدا سے دعوت کا آغاز فرمایا تھا اور جو لوگ اس دعوت کو قبول کرتے تھے ان پر رفتہ رفتہ تکالیف شرعیہ عائد کی جاتی تھیں۔ لیکن یہاں سارے کے سارے کفار ہی نہیں ہیں بلکہ مسلمان بھی موجود ہیں، اسلام تدریج نازل نہیں ہو رہا ہے بلکہ پورا کا پورا آچکا ہے اور مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہے، اب یہ ممکن نہیں ہے کہ جو شخص یا گروہ لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینے کے لیے اٹھے وہ خود پورے اسلام پر عمل کرنے کے بجائے

صرف اسی قدر تکالیف شرعیہ کا التزام کرے جتنی مکہ معظمہ میں اسلام قبول کرنے والوں پر عائد کی گئی تھیں - لہٰذا ہمیں "مکیت" کے ساتھ "مدنیت" کو بھی لے کر چلنا ہوگا۔ غیر مسلموں کو تو ہم پہلے اسی چیز کی طرف دعوت دینگے جسکی طرف انہیں مکہ میں بلایا گیا تھا۔ مگر جو مسلمان ہمارے ساتھ اس دعوت کے کام میں شریک ہونگے، اور جو غیر مسلم اسلام قبول کرکے ہمارے ساتھ ملینگے انکو تو اس پورے اسلام ہی کا التزام کرنا ہوگا جو قرآن اور سنت میں ملتا ہے۔ اگر دعوت دینے والے خود ہی اسلامی احکام کے ملتزم نہ ہوں تو دوسروں پر انکی دعوت کا کیا خاک اثر پڑیگا۔

۱۰- اسلام کے لیے میں نے بار بار "تحریک" کا لفظ جو استعمال کیا ہے اس کی شکایت مولانا عبدالماجد صاحب نے بھی کی ہے کہ تو دین اور مذہب کی جگہ اسلام کو صرف ایک تحریک بنائے دے رہا ہے جیسی سوشلزم اور فاشزم وغیرہ تحریکیں ہیں جنکے پیش نظر محض ایک دنیوی مقصد ہوتا ہے اور اسکے لیے وہ منظم حرکت کرتی ہیں - اور مولانا سید سلیمان نے تو میرے اس گناہ کی تاریخ بھی بیان فرمادی ہے۔ انکی تحقیق یہ ہے کہ متکلمین ہر زمانے میں اسلام کو اسی چیز کے سانچے میں ڈھالتے رہے ہیں جسکا زور انہوں نے اپنے زمانہ میں دیکھا ہے۔ کبھی "نیچر" کا زور تھا تو اسلام کو نیچر بنایا گیا، پھر "سولیزیشن" کا زور ہوا تو اسلام کو ایک سولیزیشن ثابت کیا گیا، اب فاشزم، سوشلزم وغیرہ تحریکوں کا زور ہے تو اس زمانہ کے متکلم (اشارہ اس نیاز مند کی طرف ہے) اس دین کو تحریک قرار دے رہے ہیں۔ حقیقت میں مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے جب میں ایسے ایسے عالی مقام لوگوں کو اتنی ہلکی باتیں اس قدر غیر محققانہ طریقہ سے لکھتے اور شائع کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ تجدید اور تجدد کا اصولی فرق یہ ہے کہ تجدید ہر زمانہ میں انہی حقائق اور انہی صداقتوں کو جو ازل سے چلی آرہی ہیں اپنے زمانہ کی زبان میں اپنے زمانہ کی ذہنیتوں اور ضروریات کے مطابق مرتب کرکے پیش کرتی ہے۔ اور تجدد اپنے زمانہ کے فتنوں سے متاثر ہوکر ان حقیقتوں اور صداقتوں ہی میں ترمیم کرنے پر آمادہ

ہو جاتا ہے - اگر ان حضرات کے نزدیک میں تجدد کا مجرم ہوں تو براہ کرم مجھے تعین کے ساتھ بتائیں کہ کہاں میں نے دین کے جوہر میں تغیر کیا ہے کسی جگہ یک سرِ مو تغیر بھی وہ بتا دیں اور میں اس سے توبہ نہ کروں تو یقیناً مجھ سے بڑا خاطی و ظالم کوئی نہ ہوگا۔ لیکن اگر انکی ساری ناراضی صرف اس بات پر ہے کہ میں نے پرانی حقیقتوں کے لیے نئے الفاظ اور نئے طرز بیان اختیار کیے ہیں اور انکو موجودہ زمانہ کی ذہنیتوں اور ضروریات کے مطابق مرتب کر کے پیش کیا ہے تو مجھے بتایا جائے کہ تجدید دین کی کوشش کرنے والوں نے کس زمانہ میں یہ جرم نہیں کیا ہے؟ اور کیا خود یہ حضرات معترضین اس کا ارتکاب نہیں کرتے رہے ہیں؟

"تحریک" کا لفظ جس مفہوم کے لیے میں استعمال کرتا ہوں اسکے لیے کوئی دوسرا ایسا لفظ مجھے نہیں ملتا جو آج کل کے عام لوگوں کے ذہن میں اس کی تصویر کھینچ دے۔ "مذہب" ایک مدت سے صرف اس معنی کے لیے مخصوص ہو گیا ہے کہ چند عقائد اور چند عبادتوں اور رسموں کا مجموعہ جنکی پابندی سے آدمی روحانی ترقی یا نجات بعد الموت کا متوقع ہو - اسی معنی کے لحاظ سے آج کل کے لوگ کہتے ہیں کہ مذہب ایک انفرادی چیز ہے، عابد اور معبود کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق ہے، اسکو اجتماعی معاملات اور ملکی انتظام سے کیا تعلق؟ اسلام کے لیے لفظ مذہب کا استعمال موجودہ دور کے لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے کہ یہ بھی اسی جنس مذاہب کا ایک فرد ہوگا - رہا "دین" تو اسے بھی ایک مدت سے مذہب اور دھرم کا ہم معنی بنا کر رکھ دیا گیا ہے - تاہم اگر دین کو اسکے وسیع معنی میں بھی استعمال کیا جائے تب بھی سننے والے کے ذہن میں اس سے صرف اتنی بات ہی آتی ہے کہ یہ پوری انسانی زندگی کے لیے ایک جامع اور ہمہ گیر نظام ہے جو عقائد و افکار سے لیکر انفرادی و اجتماعی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک کا احاطہ کرتا ہے اور جسکا تعلق دنیا اور اسکے انتظام سے بھی اتنا ہی ہے جتنا حیات بعد الموت سے ہے - لیکن یہ بات کہ دین ایک نظام ہونے کی حیثیت سے دنیا کا انتظام خود اپنے زیر اقتدار لینے کا متقاضی ہے، اور اسکے ایک نظام ہونے کا فطری اقتضا یہی ہے کہ دوسرے نظاموں کو

ہٹا کر یہ خود اُنکی جگہ قائم ہو، اور اس وجہ سے دین کی پیروی قبول کرتے ہی آدمی پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ دوسرے نظاموں کے تسلط کو مٹانے اور اس نظام کو قائم کرنے کے لیے کوشش کرے، محض لفظ "دین" سن کر آج کل کسی کے ذہن میں بھی نہیں آتی۔ اس مفہوم کو موجودہ دور میں لفظ "تحریک" اچھی طرح ادا کرتا ہے اس وجہ سے میں اسلام کے لیے "دین" کے ساتھ "تحریک" کا لفظ بھی اکثر استعمال کرتا ہوں نیز اس کوشش اور جدوجہد کے لیے بھی مجھے "تحریک" ہی کی اصطلاح استعمال کرنی پڑتی ہے، کیونکہ جہاد اور مجاہدہ کے الفاظ جو قرآن نے اس مفہوم کے لیے اختیار کیے تھے، انحطاط کے دور میں ان کے معانی بالکل بدل کر رہ گئے ہیں۔ مجاہدہ کا لفظ سن کر آج کے لوگوں کا ذہن صوفیانہ ریاضات اور چلہ کشی کی طرف چلا جاتا ہے اور "جہاد" بولیے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ بس اب ایک لشکر مرتب ہوگا اور غنیم کے خلاف معرکۂ قتال شروع ہو جائیگا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ "تحریک" کے نام سے جو چیز میں نے پیش کی ہے آیا وہ دین اور جہاد فی سبیل اللہ ہی ہے یا کوئی اور چیز۔ اگر کوئی اور چیز ہے تو بلاشبہ میں مجرم ہوں، لیکن اگر وہ دین اور جہاد ہی ہے تو محض اتنی بات پر بگڑ جانا کہ میں نے اسکے لیے نیا لفظ کیوں استعمال کیا، کم از کم صاحب معارف اور صاحب صدق جیسے حضرات کے مرتبے سے تو بہت فروتر ہے۔

یہاں تک تو میں نے اپنے خیالات کی ترجمانی اور آپکے شبہات کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے اب گرامی نامہ کے اس حصہ پر بھی کچھ عرض کرونگا جو آپ نے تذییل کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے۔ میں اپنے ان الفاظ پر باادب معافی چاہتا ہوں جو میں نے پچھلے عریضہ میں لکھے تھے۔ اللہ علیم ہے کہ میری نیت ہرگز تحقیر کی نہ تھی۔ میں اس قسم کی باتیں صرف تحریض کی نیت سے لکھا کرتا ہوں جو جذبہ مجھے کبھی کبھی حدادب سے آگے بڑھائے جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ جیسے صاحب بصیرت اور صاحب دل حضرات کو میری آنکھیں مقدمۃ الجیش میں بلکہ اس سے بھی آگے دیکھنا چاہتی ہیں۔ یہ کام جسے مجھ جیسے ایک

کم مایہ آدمی نے سنبھالا ہے جو آپ جیسے لوگوں کے کرنے کا تھا اور میرا کام یہ تھا کہ میں آپ لوگوں کی رکاب تھام کر چلتا۔ خدا کی قسم میرے دل میں نہ کبھی اس بات پر فخر پیدا ہوا کہ میں نے اس کام کو سنبھالا ہے، اور نہ کبھی یہ غلط فہمی ہوئی کہ میں اس کی سربراہی کا اہل ہوں۔ مجھے تو ہمیشہ اس بات کا افسوس ہوتا ہے کہ یہ جنکے کرنے کا کام تھا وہ اپنے مرتبے سے فروتر کاموں میں مشغول ہیں اور مجھے اپنی فرومایگی کے باوجود اس کارِ خطیر کی ذمہ داری اٹھانی پڑی ہے۔ یہی چیز جب مجھے اندر سے کاٹتی ہے تو میں بزرگوں کی شان میں اس قسم کی باتیں کہہ گزرتا ہوں جنکی آپ نے شکایت فرمائی ہے۔ لوگ گمان کرتے ہیں کہ میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگا ہوں اور بزرگوں کے منہ آتا ہوں، حالانکہ دراصل میں اپنے آپ کو چھوٹا ہی سمجھتا ہوں اور جب بڑوں کی خالی چھوڑی ہوئی جگہ پر مجبوراً مجھے کھڑا ہونا پڑتا ہے تو میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے اور کبھی کبھی جلے دل سے تلخ باتیں کہہ جاتا ہوں کہ ایک چھوٹے کا طعنہ سن کر ہی وہ کسی طرح اپنے اصل مقام پر آ کر کھڑے تو ہوں۔

آپ کا یہ شبہ کہ میں ابتلاء و امتحان کے میدان میں دعوے کے ساتھ اتر رہا ہوں، میری قلبی حالت سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں لرزتے اور کانپتے ہوئے اس میدان میں قدم رکھ رہا ہوں۔ اپنی قوت پر نظر ڈالتا ہوں تو وہ اتنی کم نظر آتی ہے کہ مجھے ہر وقت گر جانے کا خطرہ ہوتا ہے مگر جب یہ یاد آتا ہے کہ اس مختصر سے عرصۂ حیات میں کتنے گناہ کر چکا ہوں، کتنا زمانہ نافرمانیوں میں گزارا ہے، اللہ کی دی ہوئی کتنی قوتیں محض اپنے نفس کی خوشی پوری کرنے میں صرف کر ڈالی ہیں، اور اب بھی تقویٰ اور عبودیت کا کتنا حقیر سرمایہ میرے پاس ہے تو مجھے اپنی نجات کی کوئی صورت اسکے سوا نظر نہیں آتی کہ کوئی چوٹ خدا کی راہ میں کھاؤں اور اسی چوٹ کا داغ لیے ہوئے مالک کے دربار میں حاضر ہوں تاکہ شاید اسی کو دیکھ کر کچھ نظرِ عنایت ادھر مائل ہو جائے۔ میری حالت اس مریل گھوڑے کی سی ہے جس میں بل بوتہ کچھ نہیں ہے، مگر پیچھے سخت کوڑا پیٹھ پر پڑنے کا خطرہ جو اسے لگا ہوا ہے وہ اس کو

ایک پُرخطر راستہ پر بھاگ کر چلنے کے لیے مجبور کرتا ہے - آپ کو میرے جرأت آمیز الفاظ سے یہ گمان گذرتا ہوگا کہ میں اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھ رہا ہوں اور کسی بڑے مرتبے کی توقع رکھتا ہوں - حالانکہ میں جو کچھ کر رہا ہوں صرف اپنے گناہوں کی تلافی کے لیے کر رہا ہوں اور اپنی حقیقت خوب جانتا ہوں - بڑے مراتب تو درکنار اگر صرف سزا سے بچ جاؤں تو یہ بھی میری امیدوں سے بہت زیادہ ہے - البتہ میں اپنی اس قلبی کیفیت کا کوئی اثر اپنی تحریروں میں نہیں آنے دیتا اور قصداً جرأت آمیز زبان استعمال کرتا ہوں کیونکہ اس کام کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس کے لیے ڈھیلی اور کمزور زبان موزوں نہیں ہو سکتی -

یہ خط ختم کر چکا تھا کہ "صدق" کا تازہ پرچہ ملا اور کچھ باتیں مزید عرض کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی - مولانا عبدالماجد صاحب نے خود اقدام فرمانے کے بجائے جن شاہ صاحب کو آگے کیا ہے ان کے متعلق پہلے ایک عریضہ میں بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ حیدر آباد میں انہوں نے خود مجھ سے اپنا یہ کشف بیان کیا تھا کہ "مجھے حسین احمد سور کی شکل میں دکھایا گیا" حال میں جب مجھے ندوہ جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں کے متعدد اساتذہ سے معلوم ہوا کہ یہ صاحب وہاں بھی کچھ مدت رہ آئے ہیں اور مولانا حسین احمد صاحب کی شان میں "شیطان" اور "خنزیر" جیسے سخت الفاظ استعمال کرتے رہے ہیں - ایک صاحب ندوہ میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ کے مرید ہیں - اُن سے ان صوفی صاحب نے بے تکلف فرمایا کہ میرا مرتبہ تمہارے پیر سے بلند تر ہے - اور تو اور حضرت نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق انہوں نے ندوہ ہی کے بعض اساتذہ سے کہا کہ وہ ایک معمولی درجہ کے آدمی تھے - میں اسی قسم کی باتیں ان شاہ صاحب کی زبان سے سن کر پہلے ہی یہ سمجھ چکا تھا کہ صوفی ہونا تو درکنار ان کے دل میں حیا اور خوفِ خدا تک نہیں ہے - اسی لیے انکے خطوط کے جواب میں نے ہمیشہ دلی بیزاری کے ساتھ دیے اور انکی فضول بحثوں سے تعرض کیے بغیر ہر خط اس انداز میں لکھتا رہا کہ اس کے بعد دوبارہ وہ مجھے خط نہ لکھیں - اس نوعیت کی تھی وہ مراسلت جو مولانا عبدالماجد صاحب

نے اس طرح صدق میں شائع فرمائی کہ گویا میرے اور صوفی صاحب کے درمیان کوئی مناظرہ ہوا تھا جسے اختتام مناظرہ کے بعد اب افادۂ عام کے لیے پبلک کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ فریقین میں سے صرف ایک فریق کے بھیج دینے پر یہ مراسلت شائع فرمائی گئی، دوسرے فریق سے پوچھ لینے کی ضرورت بھی نہ سمجھی گئی۔ خیر یہاں تک بھی بات رہتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن اب جو ان شاہ صاحب کی تحریریں مولانا شائع فرما رہے ہیں انہیں دیکھ کر تو میں حیران رہ گیا ہوں کیا واقعی میں خدا سے جنگ کر رہا ہوں کہ مجھے محاربِ خدا قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا حقیقت میں کوئی دعویٰ میں نے کیا ہے کہ مجھے "مدعی کاذب" کا لقب دیا جا سکے؟ کیا میں نے خود اپنی کوئی شریعت بنائی ہے یا کسی نئے دین کی بنا رکھ رہا ہوں کہ مجھ پر "تاسیس دین" کا الزام عائد کیا جائے اور میرے رفقاء کو "امرائے شریعتِ مودودی" کے خطاب سے مخاطب کیا جائے؟ کیا مولانا عبدالماجد صاحب ایمانداری کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جس قدر بہتان وہ صدق میں شائع فرما رہے ہیں ان میں سے کسی کے اندر بھی ذرہ برابر حقیقت ہے؟ اگر ہے تو بیجا مروت سے کام نہ لیں بلکہ پورے ثبوت کے ساتھ ان الزامات کو پیش فرمائیں اور میری تکفیر کریں، کیونکہ ان میں سے ہر الزام ایسا ہے جس کی اگر کچھ بھی حقیقت ہو تو موجبِ کفر ہے۔ اور اگر ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو میں کہتا ہوں کہ کوئی شخص جس کے دل میں کچھ بھی خوفِ خدا اور آخرت کی باز پرس کا خیال ہو، اس قسم کے بے بنیاد بہتان اپنی ذمہ داری پر شائع نہیں کر سکتا۔ اخبار نویسی کا یہ آئین ضرور ہے کہ اپنے صفحات مختلف خیالات کے اظہار کے لیے کھلے رکھے جائیں، مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اخبار کے صفحات ہر جھوٹ اور تہمت اور ہر اس بیہودہ چیز کے لیے کھلے رہیں جو کوئی شخص کسی کے خلاف لکھ بھیجے۔ مولانا نے اگر اس آئین کا یہی مطلب سمجھا ہے تو عجب نہیں کہ ایک روز صدق کے صفحات میں لوگوں کے خلاف ماں بہن کی گالیاں بھی دیکھنے میں آ جائیں۔

مولانا عبدالماجد صاحب اگر راستی اور عدل و تقویٰ کا طریقہ اختیار کرنا پسند فرماتے تو انکے لیے یہ راہ کھلی ہوئی تھی کہ جن امور میں وہ مجھے غلطی پر سمجھتے ہیں انکو صاف صاف بیان کر دیتے اور تعین کے ساتھ یہ بتاتے کہ میں نے کہاں کس مسئلے میں حق سے تجاوز یا دین کی راہِ راست سے انحراف کیا ہے۔ اس صورت میں میرے لیے بھی کچھ عرض کرنیکا موقع تھا۔ اگر انکے اعتراضات کسی غلط فہمی پر مبنی ہوتے تو میں اسے رفع کرتا، اگر انکے دلائل صحیح ہوتے تو میں اپنی غلطی کا اعتراف کرتا، اور اگر میرے اور انکے درمیان اختلاف باقی رہتا تو اہلِ علم آسانی کے ساتھ رائے قائم کر سکتے تھے کہ کون راستی پر ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے اس سیدھے اور صاف راستہ کو اختیار کرنیکے بجائے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ ایک طرف شاہ نذیر احمد صاحب کے خطوط شائع فرما رہے ہیں، اور دوسری طرف گمنام لوگوں کے خطوط سے اقتباسات نقل کر کے میرے خلاف عجیب عجیب بدگمانیاں پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُنکے شاہ صاحب ایک ناخداترس اور غیر ذمہ دار آدمی ہیں۔ وہ آزادی کے ساتھ ہر قسم کے الزامات تراش سکتے ہیں، روز نت نئے بہتان گھڑ سکتے ہیں، میرے ایک ایک فقرے سے بیسیوں ایسے معنی نکال سکتے ہیں جو میرے خواب و خیال میں بھی نہ ہوں، اور اپنے تخیل سے بیشمار نظریات تصنیف کر کے میری طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ ایسے مردِ آزاد کے مقابلہ میں تو میرے لیے اعترافِ شکست کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ میں کہاں اسکے ساتھ روز ایک نئی وادی میں بھٹکتا پھروں۔ رہے وہ اقتباسات جو کسی "فاضل اور نامور خادمِ دین" اور کسی "صاحبِ علم" اور کسی "غالی مخالف" کے خطوط سے نقل فرمائے جاتے ہیں تو وہ سب کے سب دلائل سے خالی اور بے ثبوت دعووں پر مشتمل ہیں۔ اگر یہ فضلاء اور صاحبانِ علم اور نامور خادمانِ دین پردوں کے پیچھے سے نکل کر آتے اور صاف صاف بیان کرتے کہ میں کیا فتنہ برپا کر رہا ہوں اور میں نے کس "نتیجۂ تدبر فی السیاسیات الحاضرہ و ثمرۂ تفکر تشریعاتِ اروپا" کو کھینچ تان کر زبردستی قرآن پر منطبق کیا ہے تو میری اصلاح بھی ممکن تھی اور خود انکی اصلاح کا بھی امکان تھا۔ لیکن اب کہ وہ پردہ نشین ہیں اور انکے صرف دعاوی صدق میں نقل کیے جا رہے ہیں، میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ یہ سب میرے خلاف شکوک پیدا کرنیکی ہوشیارانہ نفسیاتی تدبیریں ہیں، اور میرے لیے اُس سطح تک اترنا مشکل ہی جہاں ایسی تدبیروں کا جواب دیا جا سکتا ہے۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ

مطبوعات

محکومیت نسواں | جان اسٹوارٹ مل کی کتاب (On liebrty) کا ترجمہ از جناب معین الدین صاحب حبیب انصاری - ضخامت ۱۲۴ صفحات مجلد - قیمت عہ ر مکتبۂ پنجاب، لاہور

مل نے یہ کتاب انیسویں صدی کی اُس حالت کے خلاف احتجاج کی غرض سے لکھی تھی جب کہ انگلستان میں عورت کے قانونی حقوق مرد کے مقابلہ میں گویا کچھ نہ تھے، اور معاشرت میں بھی پرانے مسیحی تصورات کے اثر سے اسکی حیثیت کمتر تھی - اِن حالات کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مل نے عورت کے لیے "انصاف" حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر انصاف کے معنی اسکے نزدیک یہ تھے کہ جملہ حیثیتوں سے مرد اور عورت کو برابر کردیا جائے - اس طرح وہ نادانستہ ایسی روش پر چل پڑا جو عورت اور مرد اور انسانیت، کسی کے لیے بھی انصاف نہیں کہی جاسکتی - یہ کچھ مل ہی کی خصوصیت نہیں، آزاد اہل فکر میں یہ عام بیماری ہے کہ وہ اپنے رجحانات کو فطری حقائق کا پابند بنانے کے بجائے فطری حقائق کو اپنے رجحانات کا پابند بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس بنا پر جن پرانی خرابیوں کی اصلاح کرنے کے لیے اٹھتے ہیں اُن سے بدتر خرابیاں خود پیدا کردیتے ہیں - اخلاقیات اور اجتماعیات میں ان لوگوں کی کوئی تحریر افسوس ہے کہ اِس عدم توازن سے خالی نہیں ہوتی - مل کی اس کتاب کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسکا لکھنے والا نہ تو ایک سائنٹسٹ ہے جس نے اپنی رائے کو ثابت شدہ سائنٹفک حقائق کے تابع رکھا ہو، اور نہ ایک حکیم ہے جس نے انسانی تمدن کے بنیادی مسائل پر بے لاگ اور حقیقت پسندانہ طریقہ سے غور و خوض کرکے ایک رائے قائم کی ہو - بخلاف

اس کے وہ ہم کو صاف طور پر ایک وکیل نظر آتا ہے جو اپنے مقدمہ کو ثابت کرنے کے لیے ہر قسم کی کھینچ تان کر رہا ہے، نہ مغالطہ دینے سے چوکتا ہے، نہ واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنے منشا کے مطابق ڈھالنے سے باز رہتا ہے، اور نہ اپنے مخالف دلائل کو جج کے سامنے ہلکا بنا کر پیش کرنے میں دریغ کرتا ہے۔ اسی قسم کے خام کار مفکرین کی رہنمائی کا نتیجہ ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے یورپ کی تمدنی خرابیوں کی اصلاح جن نئے طریقوں سے کی گئی وہ بیسویں صدی میں پہلے سے بدتر خرابیاں پیدا کرنے کے موجب ہوئے۔ اب یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ان لوگوں کے سقیم افکار ہماری پبلک کے سامنے بلا کسی تنقید کے پیش کیے جا رہے ہیں، حالانکہ ان افکار کے عملی نتائج بھی دیکھے جا چکے ہیں، اور ان نتائج کے خلاف خود یورپ ہی میں احتجاجی آوازیں بھی بلند ہونی شروع ہو گئی ہیں۔

مسرت سروق پرنٹنگ پریس مل روڈ لاہور میں طبع ہوا

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابو الاعلیٰ مودودی

یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سے سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدھا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنھوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کردیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور ارام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انہیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

لیکن انسان کی کچھ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہر عہد میں دنیا پر انھی افکار و اراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلواربند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی انکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذھنیت رکھنے والی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کرلیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

پس اگر اپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کما حقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

ضخامت ۶۰۰ صفحات قیمت بیجلد چار روپے مجلد پانچ روپے علاوہ محصولڈاک

دفتر رسالہ ترجمان القرآن۔ لاہور